ستمبر ۱۹۹۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

اِس شمارے کا خاص مضمون

تعلیماتِ مسیحؑ اور تعلیماتِ نبویؐ میں مطابقت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب جمعہ

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

اعلان داخلہ - قرآن کالج لاہور

① ایک سالہ "رجوع الی القرآن" کورس

قرآن کالج' لاہور میں ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ شروع ہے۔ جو اصحاب اپنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور دین کی بنیادی تعلیم (جس میں عربی گرامر' تجوید' مطالعۂ قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ کا ایک منتخب نصاب اور ترجمۂ قرآن حکیم شامل ہے) حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں' ان کے لئے یہ ایک نادر موقع ہے۔ انڈر گرایجویٹ اصحاب کے داخلے پر بھی غور ہو سکتا ہے۔

- داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل ہو جائیں گے اور تدریس کا آغاز ان شاء اللہ شروع اکتوبر سے ہو گا۔
- داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک وصول کئے جائیں گے۔ داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

② بی۔اے' تربیتی سال

قرآن کالج' لاہور میں بی۔اے (تربیتی سال) کے لئے بھی داخلے جاری ہیں۔ داخلے ستمبر کے آخر تک مکمل کر لئے جائیں گے۔ داخلہ فارم ۲۱ ستمبر تک موصول ہو جانا چاہئے۔

- داخلہ فارم موصول ہونے پر انٹرویو کی تاریخ سے بذریعہ ڈاک مطلع کر دیا جائے گا۔
- انٹر کے نتیجے کے منتظر طلبا بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- کالج میں بی۔اے کے طلبہ کے لئے کمپیوٹر کی تعلیم کی سہولت بھی موجود ہے۔

تفصیلات کے لئے پندرہ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کریں

نوٹ

مندرجہ بالا دونوں کورسوں میں طلبہ کیلئے میرٹ کی بنا پر ایک ایک وظیفہ بھی دستیاب ہے!

المعلن : پرنسپل' قرآن کالج' لاہور' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۴

شمارہ: ۹

ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

ستمبر ۱۹۹۵ء

فی شمارہ ۷/-

سالانہ زرتعاون ۷۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۴۵ سعودی ریال یا ۱۲ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۶ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۲۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔	۹ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰- فون: ۵۸۶۹۵۰۲-۵۸۶۹۵۰۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

طاہر نیوز ایجنسی اینڈ بک سینٹر

مشمولات

☆ عرض احوال ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ۷

تعلیمات مسیحؑ اور تعلیمات نبویؐ میں مطابقت و مماثلت

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ دعوت عمل ۳۱

جہاد کا اعلان کیجئے' اور لوگوں کو بیعت جہاد کی دعوت دیجئے!

قاضی حسین احمد کے نام جناب عبدالرزاق کا ایک کھلا خط

☆ مولانا مودودی اور انتخابات ۳۴

حافظ عاکف سعید

☆ دعوت فکر ۴۱

تحریک اسلامی -- تنظیم نو کی ضرورت

شاہد مجید

☆ گوشہ خواتین ۶۲

اچھے دن کون سے؟

طیبہ یاسمین

☆ رجوع الی القرآن ۶۹

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کا پراسپکٹس اور تعارف

لطف الرحمٰن خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

۲۵ اگست کے خطاب جمعہ میں امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے "اتحاد امت" کو موضوع سخن بناتے ہوئے جماعت اسلامی، تحریک اسلامی اور تنظیم اسلامی کے وفاق کی ایک تجویز شرکاء اجتماع کے سامنے رکھی کہ یہ تینوں جماعتیں جن کا فکری و نظری پس منظر ایک ہے اور جن کے رفقاء و ارکان پر دین کا ہمہ گیر اور حرکی تصور پورے طور پر منکشف ہے، جو دین کو محض نماز روزے تک محدود نہیں خیال کرتے بلکہ پورے نظام اجتماعی پر دین کے غلبہ و قیام کی جدوجہد کو فرض عین سمجھتے ہیں، وہ تطہیر افکار اور دین کی دعوت کے عظیم کام یعنی فکری و نظری سطح پر جہاد میں ایک دوسرے کی معاون بن جائیں، تاکہ ملک میں سیکولرزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے کسی درجے میں بند باندھا جا سکے۔ انہوں نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ ملک میں موجود مختلف دینی جماعتیں متحد ہو کر سیکولرزم کے خلاف صف آراء ہونے اور بنیان مرصوص بننے کی بجائے مزید تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار ہیں اور ہر جماعت کئی کئی دھڑوں میں بٹ چکی ہے۔ امیر تنظیم نے صحیح طور پر نشاندہی کی کہ دینی جماعتوں میں پائیدار اور بامعنی اتحاد کے لئے ضروری ہو گا کہ پہلے ہر جماعت کے مختلف دھڑے باہم متحد ہو کر وحدت کی صورت اختیار کریں اور پھر ان جماعتوں کے باہمی اتحاد کی جانب بتدریج پیش رفت کی جائے۔

امیر تنظیم اسلامی کی جانب سے جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کو اتحاد کی اس پیشکش کو غیر سنجیدہ اس لئے قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس اتحاد کو قابل عمل بنانے کے لئے انہوں نے خود بھی ایثار ذات کا ثبوت دیتے ہوئے الیکشن میں حصہ لینے سے متعلق اپنے سابقہ سخت موقف میں اچھی خاصی لچک پیدا کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے ۱۹۴۵ء کے موقف کو مدار قرار دے کر اس پر تینوں جماعتوں کو جمع ہونے کی دعوت دی ہے۔ مولانا مرحوم کے اس موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ انتخابات میں شرکت کا راستہ صرف اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ جب ملک کے عوام کی اکثریت کی ذہنی و فکری تطہیر کے نتیجے میں اس جماعت کا اتنی واضح اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل کرنا یقینی ہو کہ پھر وہ ملکی دستور کو بدل سکتی ہو اور ملک کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کو اپنے نظریئے کے مطابق ڈھالنا اس کے لئے ممکن ہو۔ (مولانا کا یہ موقف اور اس کی تفصیل مکمل حوالوں کے ساتھ اسی شمارے میں "مولانا مودودی اور انتخابات" نامی مضمون میں مذکور ہے) امیر تنظیم کی تجویز یہ ہے کہ تینوں جماعتیں ایک وفاق کی شکل میں متحد ہو

جائیں اور سردست الیکشن کو بھلا کر باہم مل جل کر ملک میں غلبہ و اقامت دین کی راہ ہموار کرنے کے لئے فکری و نظری سطح پر پوری یکسوئی کے ساتھ بھرپور دعوتی کام میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ انتخابات میں حصہ لینے کے امکان پر صرف اس وقت غور کیا جائے جب یقین ہو جائے کہ اس کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کی معین کردہ شرائط بتمام و کمال پوری کی جا چکی ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی کے اس خطاب جمعہ کی پریس ریلیز ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔ تاہم اس خطاب کی اہمیت کے پیش نظر ارادہ یہ ہے کہ اس خطاب کو از اول تا آخر آئندہ "میثاق" میں شائع کیا جائے۔ السعی منا والاتمام من اللہ

"لاہور ۲۵ اگست' دین ایک ہمہ گیر وحدت ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر حضورؐ تک ایک رہا ہے جسے دنیا میں قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ البتہ جس طرح شریعتیں جدا جدا اور الگ الگ تھیں ویسے ہی انبیاء کا منہاج اور طریق کار بھی الگ اور جداگانہ تھا۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اصل دین اللہ کی حاکمیت اور حضور اکرم ﷺ کی اطاعت کلی کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس وقت امت مسلمہ نہ صرف خود فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے بلکہ اس نے دین کی وحدت کو بھی پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا دینی سیاسی جماعتوں کی غلط حکمت عملی کی وجہ سے پاکستان میں اسلام کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ سیاسی میدان میں سرگرم عمل مذہبی جماعتوں نے نفاذ اسلام جیسے مطالبے کو بھی ایک سیاسی نعرے کی شکل دے دی جس کی وجہ سے نفاذ اسلام کا معاملہ بھی انتخابی کشاکش میں ایک متنازعہ مسئلہ بن کر رہ گیا۔

امیر تنظیم اسلامی نے تاریخی اور نظریاتی لحاظ سے ہم خیال اور یکساں موقف کی حامل مذہبی سیاسی جماعتوں کے اتحاد کا عملی خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت ہے کہ دینی جماعتیں باہمی اختلافات پر مبنی محاذ آرائی اور تصادم کی پالیسی سے گریز کریں۔ یکساں پس منظر کی حامل جماعتیں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایسی جماعتیں اگر ایک دوسرے میں مدغم نہ ہو سکیں تو کم از کم ان جماعتوں کو ایک "وفاق" ہی قائم کر لینا چاہئے۔ انہوں نے جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی پر مشتمل ایک مشترکہ وفاق قائم کرنے کی تجویز دیتے ہوئے کہا کہ تینوں جماعتوں کا وفاق الیکشن میں حصہ نہ لینے کا اعلان کرے جب تک کہ اس مجوزہ اتحاد کی مجلس شوریٰ کی دو تہائی اکثریت اور وفاق میں شامل ہر جماعت کے کارکنوں کی نصف تعداد یہ فیصلہ نہ کر دے کہ نظام کی تبدیلی کے لئے درکار رائے عامہ بڑی حد تک ہموار اور موثر تعداد میں بیدار ہو چکی ہے اور ملکی دستور کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے انتخابی نظام کے ذریعے ایک ہی مرحلے

میں کامیابی کا حصول یقینی نظر آرہا ہو۔ اس مجوزہ وفاق کی مجلس شوریٰ کی تشکیل کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اسلامی تحریکوں کے اس وفاق کی مجلس شوریٰ میں جماعت اسلامی کے پچاس فیصد اور تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی کے ۲۵، ۲۵ فیصد نمائندے شریک ہوں۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا تینوں جماعتوں کی دعوت فرقہ واریت سے پاک ہے اور یہ جماعتیں دین کی دعوت اور اسے نافذ کرنے کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں۔ اسلامی نظام کو رائج کرنے کے لئے ان جماعتوں میں آخری مرحلے یعنی اقدام پر اختلاف رائے ہے۔ انہوں نے کہا انتخابی سیاست کے ذریعے اسلام کے نفاذ کی جدوجہد ایک بیکار کوشش اور سعی لاحاصل ہے۔ تنظیم اسلامی اور مولانا نعیم صدیقی کی تحریک اسلامی انتخابی سیاست پر قریباً یکساں موقف کی حامل جماعتیں ہیں جبکہ قاضی حسین احمد الیکشن میں حصہ لینے کو لازمی اور ضروری سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا اسلام کی مخالف منظم قوتوں کے مقابلے میں اگر اب بھی دینی جماعتیں متحد نہ ہوئیں تو پھر لادینی عناصر اور سیکولر قوتیں دین کی بیخ کنی کا کام پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ جاری رکھیں گی۔

رسولوں کے منہاج کی وضاحت کرتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے کہا حضرت موسیٰؑ کی پیغمبرانہ جدوجہد ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کو فرعون کی غلامی کے چنگل سے نکال کر فلاح و کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی اس سنت پر عمل پیرا ہو کر مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کے نام سے بے مثال جدوجہد کی جس کے نتیجے میں پاکستان کے نام سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست قائم ہو گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا اور ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہو جاتا تو وہاں کی ہندو اکثریت مسلمانوں کی کثیر تعداد کو جبراً ہندو بننے پر مجبور کر دیتی۔ انہوں نے کہا حالات و قرائن بتا رہے ہیں کہ نظام خلافت کا احیاء اور اسلام کے غلبے کی ابتداء پاکستان اور افغانستان کی سرزمین ہی سے ہو گی۔ اسلام کو غالب و نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے مگر پاکستان کے قیام سے مسلمانانِ پاکستان کی ذمہ داری میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا حضرت ابراہیمؑ نے جگہ جگہ توحید کے مراکز قائم کئے۔ صوفیائے کرام نے ابراہیمی اسوہ کی پیروی میں پورے برصغیر میں شریعت اور تصوف کے حوالے سے دینی مراکز قائم کئے جبکہ ان کے گدی نشینوں نے اکثر و بیشتر اس سلسلے کو ایک دھندا بنا لیا ہے اور دین کے پردے میں بدترین دنیاداری ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر لوگوں میں گھوم پھر کر دین کی حقیقتوں کو واضح کیا۔ تبلیغی جماعت نے اسی عیسوی طریق کار کو اپنا رکھا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج انقلابی تھا۔ ختم نبوت اور تکمیل رسالت کے بعد اب قیامت تک کے لئے امت مسلمہ اپنے عروج اور اسلام

کے غلبے کے لئے نبویؐ طریق کار پر عمل کرنے کی پابند ہے۔ اس نبویؐ جدوجہد کے ذریعے استحصالی نظام کا خاتمہ کر کے باطل قوتوں کو پاش پاش کر دیا گیا۔ طریقہ نبویؐ پر مبنی اسلامی جہاد کا ہدف دین کا قیام ہے جس کے لئے اہل حق کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہو گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے ملک کی تمام مذہبی اور دینی جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ باہمی طور پر اتحاد کی راہ اختیار کر کے اللہ کے "مضبوط رسے" سے جڑ جائیں۔"

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی ۲۸/ اگست کی صبح کو نیویارک کے لئے روانہ ہو گئے۔ انہیں ۱۸ تاریخ کو روانہ ہونا تھا لیکن علالت کے باعث انہوں نے اپنی روانگی کو موخر کیا۔ انہیں اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکا (ISNA) کی جانب سے ان کے سالانہ کنونشن میں شرکت کی دعوت ملی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر تنظیم نے اسنا کے کنونشن سے متصل تنظیم اسلامی نارتھ امریکا (TINA) کے کنونشن کے انعقاد کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ امیر محترم کی واپسی ان شاء اللہ وسط اکتوبر تک ہو گی۔ OO

قرآن اکیڈمی کامرس کالج (انگلش میڈیم)

سال اول انٹرمیڈیٹ میں داخلے جاری ہیں

انجمن خدام القرآن سندھ کے زیر اہتمام تعلیمی سال ۹۶-۱۹۹۵ء سے قرآن اکیڈمی کامرس کالج (برائے طلباء) کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

چونکہ امت مسلمہ کا احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایسے ذہین، خدا ترس اور تعلیم یافتہ افراد کی کوششوں سے ممکن ہے جن کی فکر حکمت قرآنی کی محکم بنیاد پر قائم ہو اور جو ساتھ ساتھ دنیوی علوم پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔ لہٰذا قرآن اکیڈمی کامرس کالج میں بورڈ آف انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے مقررہ مضامین کے علاوہ ابتدائی عربی گرامر، تجوید اور قرآن حکیم کے منتخب حصوں کی لازمی تدریس کا اہتمام کیا گیا ہے۔

قرآن اکیڈمی کامرس کالج میں داخلے کے لئے پراسپکٹس اور داخلہ فارم بعوض پچاس روپے دستیاب ہیں۔ داخلہ فارم جمع کرانے کی آخری تاریخ ۷ ستمبر ۱۹۹۵ء ہے۔

ڈی۔ ایم۔ ۵۵، خیابان راحت، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

فون : 5854036 ، 5855219

تعلیماتِ مسیحؑ اور تعلیماتِ نبویؐ میں مطابقت و مماثلت

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۲/جون ۹۵ء کے خطاب جمعہ سے ماخوذ

خطبۂ مسنونہ' سورۂ آل عمران کی آیات ۴۲ تا ۵۴ اور سورۃ المائدہ کی آیات ۱۰۹ تا ۱۱۱ کی تلاوت کے بعد امیر محترم نے پہلے نئے ہجری سال کے آغاز کے حوالے سے مختصر سی گفتگو کی۔ بعد ازاں مسجد دار السلام میں اپنے سابقہ خطاب جمعہ بعنوان "پاکستانی مسیحیوں کی خدمت میں چند گزارشات" (شائع شدہ میثاق اگست ۹۵ء) کا خلاصہ بیان کیا اور پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے محولہ بالا آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ پیش کیا۔

﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ .....
..... وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝﴾ (آل عمران : ۴۲ تا ۵۴)

"ذرا یاد کرو جبکہ فرشتوں نے مریم سے کہا تھا : اے مریم! اللہ نے تمہیں چن لیا ہے' تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہارا انتخاب کر لیا ہے تمام جہان کی خواتین پر۔ اے مریم! اپنے رب کے لئے کھڑی رہا کرو' اور سجدہ کرو اور رکوع کیا کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ (اے نبی ﷺ) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی جانب وحی کر رہے ہیں۔ آپ تو ان لوگوں کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ (ہیکل کے خادم) قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا' اور آپ تو وہاں موجود نہیں تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

اور یاد کرو جبکہ فرشتوں نے مریم سے کہا : اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت

دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمے کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہو گا"۔ یہاں "کَلِمَۃٍ مِنۡہُ" کے الفاظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، تاہم وقت کی کمی کے باعث اِس وقت ان پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ انجیل میں [سینٹ یوحنا (John) کے گوسپل کے ابتدائی حصے میں] بھی یہ مضمون آیا ہے جو قرآن حکیم میں دو تین مقامات پر وارد ہوا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو کلمہ کیوں کہا گیا؟ اس کے بارے میں مَیں ایک مضمون میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو حکمت قرآن میں شائع ہوا تھا، لیکن ہنوز کتابی شکل میں نہیں آیا۔ سینٹ یوحنا نے بھی بات یہیں سے شروع کی ہے : "اس زندگی کے کلام کی بابت جو ابتدا سے تھا..." کلمہ یا کلام متکلم کی شخصیت کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے، وہ اس سے صادر ہوتا ہے اور اللہ کا کلامِ "کُن" اس کائنات کی تخلیق کا ذریعہ بنا ہے۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے حرفِ "کُن" سے پیدا کرنی چاہیں وہ پیدا کر دیں اور انہیں مخصوص طبعی اور کیمیائی خصوصیات ودیعت کر دیں۔ اب یہ نظام مخصوص طبعی و کیمیائی قوانین کے مطابق خود بخود چل رہا ہے اور اس کو چلانے کے لئے مزید "کُن" کی ضرورت نہیں۔ گویا کہ چابی بھر دی گئی ہے اور گاڑی خود بخود چل رہی ہے۔ لیکن جہاں اس نظام کو توڑا جائے گا، اس کے طبعی قوانین کے خلاف کہیں جانا ہو گا وہاں ایک اضافی "کُن" درکار ہو گا۔ ("Theory of Evolution" اور "Theory of Mutation" کے درمیان اصل مسئلہ بھی اسی لفظِ "کُن" سے حل ہوتا ہے۔) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کَلِمَۃٍ مِنۡہُ" اس لئے کہا گیا کہ انہیں بِن باپ کے پیدا کیا گیا۔ یہاں پر طبعی قانون ٹوٹ رہا تھا، طبعی قانون کے تحت ولادتِ انسانی کا سلسلہ ایک ماں اور ایک باپ سے ہوتا ہے، لیکن یہاں اس سلسلے کی ایک کڑی موجود نہیں تھی، لہٰذا تخلیقِ مسیح کے ضمن میں یہ حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافی کلمۂ کُن کی صورت میں صادر ہوا۔ "جو دنیا اور آخرت میں باعزت ہو گا اور ہمارے بہت مقرب بندوں میں سے ہو گا، اور وہ لوگوں سے بات کرے گا گود میں بھی (جبکہ وہ شیر خوار ہو گا) اور بڑی عمر میں بھی"۔ واضح رہے کہ کہولت کی عمر پچاس سال کے بعد شروع ہوتی ہے، جبکہ حضرت مسیحؑ کا رفعِ سماوی (یا

عیسائیوں کے نزدیک ان کا مصلوب ہونا) ۳۳ برس کی عمر میں ہوا۔ چنانچہ ان الفاظِ قرآنی میں ان کی آمدِ ثانی کی پیشینگوئی ہے۔ حدیث نبویؐ کے مطابق زمین پر دوبارہ آنے کے بعد حضرت مسیحؑ کی شادی بھی ہوگی اور ان کے ہاں اولاد بھی ہوگی۔ "اور وہ ہمارے صالح بندوں میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا: پروردگار (یہ مجھے کیا خوشخبری دی جارہی ہے؟) میرے ہاں کوئی اولاد کیسے ہو جائے گی جبکہ مجھے کسی انسان نے چھوا تک نہیں۔ فرمایا: اسی طرح ہوگا' اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے (اس کا اختیار مطلق ہے' وہ قانونِ طبعی کا پابند نہیں ہے' بلکہ قانونِ طبعی اپنے نتائج و آثار کے لئے اس کے اِذن کا محتاج ہے) وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرماتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ اسے سکھائے گا کتاب بھی اور حکمت بھی اور تورات بھی اور انجیل بھی"۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مسیحؑ کو سکھائے جانے کے ضمن میں چار چیزوں کا ذکر ہوا ہے' یعنی کتاب' حکمت' تورات اور انجیل۔ آج کی نشست میں ان کے بارے میں قدرے مفصل گفتگو ہوگی۔ "اور وہ رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف"۔ یہاں پر "وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کے الفاظ بہت اہم ہیں۔ ان میں گویا یہ صراحت ہے کہ حضرت مسیحؑ پوری نوعِ انسانی کی طرف رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ خود حضرت مسیحؑ کا قول موجود ہے کہ میں تو اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں۔ (اور جب وہ بحیثیتِ رسول بنی اسرائیل کے پاس آئے تو انہوں نے کہا) "میں تمہارے پاس آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے نشانیاں لے کر (اور ایسی ایسی عظیم نشانیاں لے کر) کہ میں تمہارے سامنے گارے سے پرندے کی شکل بناتا ہوں' پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندے اور کوڑھی کو (ہاتھ پھیر کر) بھلا چنگا کر دیتا ہوں۔ اور اللہ کے حکم سے میں مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں۔ اور میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ تم کیا کھا کر آئے ہو اور کیا تم نے ذخیرہ کر کے اپنے گھروں کے اندر رکھا ہوا ہے۔ اس میں یقیناً تمہارے لئے بھرپور نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔ اور جو تورات میرے سامنے موجود

ہے میں اس کی تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں۔ اور میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کردوں جو (مولویانہ موشگافیوں کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔ اور دیکھو، میں تمہارے پاس یہ نشانی لے کر آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ یقیناً اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، چنانچہ تم اسی کی بندگی کرو۔ یہی ہے جو سیدھا راستہ ہے۔

پھر جب عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی طرف سے یہ محسوس کیا کہ یہ کفروانکار پر اَڑ گئے ہیں تو ندا بلند کی کہ کون ہیں جو میرے مددگار ہوں اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے (ان کی ندا پر لبیک کہتے ہوئے) کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار! ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، آپ بھی گواہ رہیں کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اے پروردگار، ہم ایمان لے آئے ہیں اس پر جو تو نے نازل فرمایا، اور ہم نے تیرے رسول کی پیروی قبول کی، پس تو ہمارا نام گواہی دینے والوں میں درج کرلے۔ اور بنی اسرائیل نے (مسیحؑ کے خلاف) اپنی سی چالیں چلیں اور اللہ نے اپنی چال چلی۔ اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے"۔ اللہ کی چال یہ تھی کہ جس شخص (یہودا اسکریوتی) نے حضرت مسیحؑ سے غداری کرتے ہوئے مخبری کی تھی اس کی شکل حضرت مسیحؑ کی سی بنادی گئی، چنانچہ وہ گرفتار ہوا اور سولی چڑھ کر کیفرکردار کو پہنچا۔ اس طرح اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی اور آسمان سے اترنے والے چار فرشتے حضرت مسیحؑ کو زندہ سلامت آسمان پر اٹھا لے گئے۔ اس کی پوری تفصیل انجیل برناباس میں موجود ہے۔

سورۂ آل عمران کی مذکورہ بالا آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے قبل حضرت مریم کو دی جانے والی بشارتوں سے بات شروع ہوئی، پھر قوم نے حضرت مسیحؑ کے ساتھ جو معاملہ کیا اس کا ذکر بھی ہوا۔ گویا یہ تو دنیا کا معاملہ ہوا، قیامت کے دن کیا ہوگا؟ اسے سورۃ المائدہ کے آخر میں اس طرح بیان کیا گیا:

﴿یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ....
قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْھَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: ۱۰۹تا۱۱۱)

"جس روز اللہ تعالیٰ سب رسولوں کو جمع کر کے پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ (یعنی تمہاری دعوت کے نتیجے میں تمہاری قوموں کا ردعمل کیا تھا؟) تو وہ کہیں گے کہ ہمیں کل علم تو حاصل نہیں ہے، تمام غیبوں کا جاننے والا تو خود ہے"۔ یہ گویا ادب کا کلمہ ہے کہ بجائے اپنی طرف سے بات شروع کر دینے کے، اپنے علم کی نفی کی جائے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل یہ تھا کہ جب حضور ﷺ ان سے کوئی سوال کرتے تو اکثر و بیشتر پہلے ایک دو مرتبہ کہتے: اَللّٰہُ وَرَسُولُہٗ اَعْلَم۔ پھر جب آپؐ اصرار کرتے تو اپنی طرف سے جواب دینے کی کوشش کرتے۔" (پھر تصور کرو اس موقع کا) جب اللہ فرمائے گا کہ: اے مریم کے بیٹے عیسیٰ!" یہ قرآن حکیم کا بڑا پُر جلال مقام ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے تمام تر علوِ مرتبت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ایک بندے ہی تو ہیں۔ شیخ ابن عربی کی جانب منسوب یہ ایک بڑا پیارا شعر ہے۔

اَلرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّل
وَالْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی

(رب رب ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول فرمالے اور بندہ بندہ ہی رہتا ہے خواہ اسے کتنا ہی عروج حاصل ہو جائے)---- حدیثِ نبویؐ کے مطابق ہر شب کے پچھلے حصے میں اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا یعنی پہلے آسمان تک نزول فرماتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رب کہیں نیچے آ گیا، بلکہ رب تو رب ہی ہے۔ اور بندہ خواہ کتنے ہی مقامات بلند حاصل کر لے، خواہ اسے کتنا ہی عروج حاصل ہو جائے وہ بندہ ہی رہتا ہے۔ محمد عربی ﷺ ساتویں آسمان تک پہنچ کر بھی "عبد" ہی رہے: فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی۔

"ذرا یاد کرو میرے ان انعامات کو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوئے۔ جب میں نے روح القدس سے تمہاری تائید اور مدد کی، تم لوگوں سے گفتگو کرتے تھے جبکہ تم گود میں تھے اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور یاد کرو جب میں نے تمہیں تعلیم دی تھی کتاب کی اور حکمت کی اور تورات کی اور انجیل کی"۔ یہ بات میں نے بارہا بیان کی ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو بار ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ یہ دوسرا مقام ہے جہاں حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کو تعلیم دی جانے والی چار چیزوں کا ذکر ہوا ہے۔ "اور جب تم میرے حکم سے گارے سے پرندے کی سی صورت بناتے تھے' پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا تھا' اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور تم مُردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل (کے ہاتھوں کو) تم سے روکے رکھا (جبکہ وہ تو تمہاری تکا بوٹی کرنے پر تلے ہوئے تھے) جبکہ تم ان کے پاس صریح نشانیاں لے کر پہنچے تو ان میں سے جو لوگ منکرِ حق تھے انہوں نے کہا یہ نشانیاں جادوگری کے سوا اور کچھ نہیں (اور چونکہ جادو کفر ہے لہٰذا یہ کافر ہو گیا ہے اور اس بنا پر واجب القتل ہو گیا ہے) اور یاد کرو جب میں نے تمہارے حواریوں کو اشارہ کیا تھا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسولوں پر۔ تب انہوں نے کہا تھا کہ ہم ایمان لائے' اور آپ بھی گواہ رہیں کہ ہم مسلم ہیں!"۔

☆ ☆ ☆

میں نے قرآن حکیم کے دو مقامات سے چند آیات اور ان کا ترجمہ آپ کے سامنے رکھا ہے تاکہ اندازہ ہو کہ قرآن مجید کی رو سے حضرت مسیحؑ کے بارے میں اہل سنت کے عقائد کیا ہیں --- ان کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسائیوں کو ذرا سوچنا چاہئے کہ وہ کس کی مخالفت کس کے آلۂ کار بن کر کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر میں اپنے یہاں کے گزشتہ خطابِ جمعہ میں قدرے تفصیل سے بات کر چکا ہوں۔ ہم اپنے وسائل کے مطابق ان باتوں کو عام کرنا چاہتے ہیں۔ باقی ان کے نتائج و عواقب اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

تعلیماتِ مسیحؑ کے بارے میں چند مغالطے

آج اصل میں میں یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ایک تو عیسائیوں اور یہودیوں کے اندر مختلف غلط فہمیاں ہیں' لیکن خود ہم مسلمانوں میں بھی حضرت مسیحؑ کے بارے میں بہت سے مغالطے موجود ہیں' خاص طور پر ان کی تعلیمات کے بارے میں ہم بہت سے مغالطوں کا شکار ہیں۔ مثلاً یہ بات آپ کو بہت عام ملے

گی اور ہمارے عام واعظین اور مقررین حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا اسلامی تعلیمات سے تقابل کرتے ہوئے اسے بڑے زور شور سے بیان کرتے ہیں اور اس طرح حضرت مسیحؑ کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں کہ "اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے پیش کردو"۔ اسے بڑی خلافِ فطرت تعلیم قرار دیا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں قرآن کا قانونِ قصاص پیش کیا جاتا ہے۔ میں اصل میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور قرآن مجید کی تعلیمات میں یہ جو ظاہری تضاد نظر آتا ہے اس کی اصل وجہ' اس کا سبب اور اس کی بنیاد کیا ہے اور اس کی تہہ میں اصل کیا چیز کار فرما ہے؟ اس کے لئے پہلے ان چار چیزوں کو سمجھنا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مسیحؑ کو تعلیم دی گئیں اور جن کا ذکر قرآن مجید کے مذکورہ بالا دونوں مقامات پر آیا ہے۔ یعنی ۱) کتاب' ۲) حکمت' ۳) تورات' ۴) انجیل---

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ

لیکن اس اعتبار سے پہلے ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اساسی منہاج کے بارے میں جو چار اصطلاحات (تلاوتِ آیات' تزکیہ' تعلیمِ کتاب' تعلیمِ حکمت) قرآن مجید میں چار مرتبہ آئی ہیں خود ان کے بارے میں مسلمان مغالطوں میں مبتلا ہیں تو حضرت مسیحؑ کے بارے میں کیوں نہیں ہو جائیں گے؟ سورۃ البقرہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کے الفاظ نقل ہوئے ہیں :

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (آیت ۱۲۹)

"پروردگار' ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو' جو انہیں تیری آیات سنائے' انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے"۔

یہ سورۃ البقرہ کا پندرہواں رکوع ہے۔ اسی سورۃ کے اٹھارہویں رکوع میں فرمایا گیا کہ دیکھو' ابراہیم اور اسماعیل نے جو دعا کی تھی محمدؐ رسول اللہ (ﷺ) دراصل اسی کا ظہور ہیں :

﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (آیت ۱۵۱)

"جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا' جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے' تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے....."

سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران کے مابین آپس میں نسبتِ زوجیت ہے' چنانچہ یہی مضمون زیادہ آن بان اور شان کے ساتھ سورۂ آل عمران میں بایں الفاظ آگیا :

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (آیت ۱۶۴)

"درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیاں سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

اور آخری مرتبہ یہ مضمون سورۃ الجمعہ میں آیا :

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (آیت ۲)

"وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے' اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

اس ضمن میں مَیں نے کل ہی قرآن کالج میں ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کے شرکاء کو اپنے ایک مضمون "انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج" کا مطالعہ کروایا ہے۔ بیس صفحات پر مشتمل یہ مضمون دراصل میں نے ۱۲/ ربیع الاول ۱۹۷۷ء کو شام ہمدرد کی ایک تقریب میں مقالے کی صورت میں پیش کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان چار اصطلاحات کے ضمن میں مسلمانوں کے ذہنوں میں بہت بڑے مغالطے موجود ہیں اور وہ ان میں سے صرف دو (یعنی تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب) کو قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں۔ "تلاوتِ آیات" سے

قرآن کا پڑھ کر سنا دینا مراد لیا جاتا ہے اور عام طور پر ہمارے علماء اس کی وضاحت کرتے ہوئے تلاوتِ آیات کو ناظرہ قرآن پڑھا دینے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ "تزکیہ" کو ایک بالکل علیحدہ شے سمجھا جاتا ہے اور اسے اس سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ تاہم "تعلیمِ کتاب" کا مفہوم قرآن حکیم کی تعلیم ہی سمجھا جاتا ہے۔ گویا تلاوتِ آیات میں قرآن کا ناظرہ پڑھنا پڑھانا اور پھر تعلیمِ کتاب میں قرآن حکیم کا ترجمہ و تفسیر آجاتے ہیں۔ لیکن "الحِکمۃ" کو پھر قرآن سے خارج قرار دیا جاتا ہے اور اس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ سنت ہے، حدیث ہے یا کوئی اور شے ہے۔ اس طریقے سے ان چاروں کو علیحدہ علیحدہ کر کے ڈِوا اور ڈِگّو میں تقسیم کر دیا گیا ہے، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ چاروں در حقیقت قرآن مجید ہی کے اجزاء ہیں۔

<u>تلاوتِ آیات</u> : قرآن حکیم کا ایک حصہ وہ ہے جو دلائل و براہین پر مشتمل ہے --- آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی سے استشہاد کرتے ہوئے توحید کے دلائل، ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے دلائل --- اور "تلاوتِ آیات" سے قرآن کا یہ حصہ مراد ہے۔ اور سب سے پہلے قرآن کا یہی حصہ نازل ہوا۔

<u>تزکیہ</u> : تلاوتِ آیات ہی کا منطقی نتیجہ "تزکیہ" ہے۔ یعنی جب آپ کا فکر درست ہو جائے گا تو عمل بھی درست ہو جائے گا۔ع "گندم از گندم بروید جو زِ جو!" اگر فکر، عقیدہ اور نظریات غلط ہیں تو اعمال بھی غلط ہوں گے۔ اگر آپ کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں، 'بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' تو پھر آپ گھرے اڑائیں گے، جو بھی کر سکیں گے کریں گے، پھر آپ کا نظریہ یہ ہو گا کہ جہاں بھی ہاتھ پڑ سکتا ہو اسے کیوں روکا جائے؟ لیکن اگر یہ یقین ہو جائے کہ نہیں، مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے اور اخروی محاسبہ کے نتیجے میں جزا و سزا کا سامنا کرنا ہے تو آپ پھونک پھونک کر قدم رکھیں گے۔ اس سب کا دارومدار آپ کی فکر پر ہے۔ چنانچہ تزکیہ دراصل غلط مادہ پرستانہ، ملحدانہ اور مشرکانہ افکار و نظریات کی جڑیں کاٹ کر توحید و رسالت اور معاد کی بنیاد پر ایک شخص کے ذہن کی تعمیرِ نو کا نتیجہ ہے۔ اب اس سے اس کے برے اعمال، برے اخلاق، برے

کردار اور بری عادات اسی طرح جھڑ جائیں گی جیسے پت جھڑ میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ خود قرآن حکیم میں یہ الفاظ آئے ہیں :

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ...﴾ (یونس : ۵۷)

"لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفاء ہے"۔

یعنی سینوں کے اندر جو روگ ہیں ان کی شفاء بھی یہی قرآن ہے۔

تعلیمِ کتاب : "تلاوتِ آیات" اور "تزکیہ" کے بعد اس سلسلے کی تیسری اصطلاح "تعلیمِ کتاب" ہے۔ اور "کتاب" سے مراد در حقیقت اَحکام ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں احکام کا ذکر بالعموم اس اسلوب میں کیا جاتا ہے : كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ، كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ، كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا اِلْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ۔ اسی طرح نماز کے بارے میں فرمایا گیا : "اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا"۔ ایسے ہی عیسائیوں کے رَہبانیت اختیار کرنے کے بارے میں فرمایا گیا : "مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ"۔ غرضیکہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں کسی چیز کی مشروعیت اور فرضیت کا ذکر آتا ہے اس کے لئے "کتاب" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن ہی کا وہ حصہ جو اَحکام یعنی اوامر و نواہی پر مشتمل ہے وہ "کتاب" ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ حصہ ہجرت کے بعد نازل ہوا ہے۔ صرف نماز کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہجرت سے دو سال قبل معراج کے موقع پر فرض ہو گئی تھی، ورنہ روزہ بھی ہجرت کے بعد فرض ہوا، زکوٰۃ کا نظام بھی بعد میں آیا، حج کے بارے میں ساری تعلیمات بعد میں آئیں، شراب کی حرمت بعد میں آئی، سود کی حرمت تو بہت بعد میں آئی۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم میں "کتاب" کا حصہ بعد میں نازل ہوا۔

تعلیمِ حکمت : جہاں تک "حکمت" یعنی دانائی کا تعلق ہے یہ در حقیقت تعلیم و تربیت

نبوی کا درجہ تخصّص ہے' یہ سب کے لئے نہیں ہے' بلکہ صرف اُن افراد کے لئے ہے جو اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ انہیں قرآن حکیم سے وہ حکمت اور دانائی حاصل ہوتی ہے جس سے تمام احکام مبنی بر حکمت نظر آنے لگیں اور انہیں اس حقیقت کا ادراک حاصل ہو جائے کہ یہ احکام ہم پر جبراً ٹھونسے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں ہماری ہی مصلحتیں ہیں' ان میں ہمارے لئے فوائد ہیں' انہی سے نظامِ انسانی درست ہو گا' انہی سے ہماری معاشرت اور معیشت کا نظام درست ہو گا' انہی کے نتیجے میں یہاں عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہو گا۔ جب یہ بصیرتِ باطنی پیدا ہو جاتی ہے تو یہ حکمت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے اساسی منہاج کو ان چار اصطلاحات کے حوالے سے سمجھنا ضروری ہے' اور ان چاروں کا تعلق قرآن حکیم سے ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ہمارے لئے بڑی قابل احترام شخصیت ہیں' انہوں نے حکمت سے مراد حدیث یا سُنّت لی ہے' اور اس سے عام طور پر یہ گمان ہو گیا ہے کہ حکمت کا تعلق قرآن سے نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن خود کہتا ہے کہ :

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾

(الاسراء : ۳۹)

"یہ ہے وہ شے (اے نبیؐ) جو آپ پر آپ کے رب نے نازل کی ہے از قبیلِ حکمت"۔

گویا حکمت بھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر "نازل" کی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حدیث کے بارے میں یہ الفاظ نہیں آئے۔ مزید برآں سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۱ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۱۳ میں "کتاب" اور "حکمت" دونوں کے ساتھ "نزول" کا لفظ آیا ہے۔ البتہ یہ بات ایک حکیمانہ نکتہ کے طور پر سمجھ لیجئے کہ پورے قرآن کی شرح حدیثِ نبویؐ ہے' اگرچہ ایک اعتبار سے ان کے مابین معکوس (Reciprocal) نسبت ہے۔ یعنی قرآن حکیم میں "آیات" کا بیان بہت تفصیلی ہے۔ دو تہائی قرآن مکی ہے اور مکی سورتوں میں سب سے بڑا مضمون یہی آیاتِ آفاقی و انفسی کا ہے' لیکن حدیث میں اس کی تشریح و توضیح بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے چھوڑ دیا کہ جیسے جیسے

سائنس آگے بڑھے گی آیاتِ آفاقی و انفسی خود بخود مزید اجاگر ہوتی چلی جائیں گی۔ حدیث میں اس کی شرح کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ انسان اُس وقت جبکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ دنیا میں بھیجے گئے' اس پوزیشن میں تھا کہ ان کو بالتفصیل سمجھ سکتا۔ چنانچہ ان کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمادیا گیا :

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ (حٰمٓ السجدہ : ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"۔

اور اب جتنی سائنسی ترقی ہو رہی ہے اور جو سائنسی انکشافات اور اکتشافات ہو رہے ہیں ان کے نتیجے میں ثابت ہو رہا ہے کہ قرآن مجید یہ بات اس انداز میں بہت پہلے کر چکا ہے۔ البتہ کتاب' تزکیہ اور حکمت' ان تینوں کی شرح آپ کو حدیث میں ملے گی' لیکن ان میں سب سے زیادہ شرح حکمت کی اور پھر احکام کی ملے گی۔ گویا کہ پہلی چیز "تلاوتِ آیات" قرآن ہی میں سب سے زیادہ تفصیل سے آگئی' لہٰذا حدیث میں اس کا مفصل تذکرہ کرنے کی ضرورت نہ تھی' جبکہ آخری چیز "حکمت" قرآن مجید میں بہت خفی اور مخفی ہے' لہٰذا حدیث میں اس کی تفصیلی شرح آئی ہے۔ اس اعتبار سے امام شافعیؒ کے قول کی بھی ایک تاویل اور توجیہ ہو جاتی ہے۔ لیکن حکمت سے صرف حدیث مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ہی تلاوتِ آیات سے متعلق ہے' قرآن ہی تزکیہ کا ذریعہ ہے' قرآن ہی کتاب یعنی احکام کا مجموعہ ہے' اور قرآن ہی کے اندر حکمت بھی ہے۔

سابقہ کتبِ سماویہ اور قرآن کا تقابل

اب اس پس منظر میں سمجھئے کہ تورات' انجیل اور زبور کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں' اس میں حکمت کی تعلیم دی جا سکتی ہی نہیں تھی' کیونکہ اُس وقت نسلِ انسانی ذہنی اور فکری اعتبار سے ابھی عہدِ طفولیت میں تھی' لہٰذا تورات صرف "کتاب" ہے۔ زبور حمد کے ترانوں پر مشتمل ہے' یعنی اس میں آپ کو صرف "آیات"

ملیں گی، جبکہ انجیل صرف "حکمت" ہے۔ قرآن مجید میں بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں واضح الفاظ میں آیا ہے کہ :

﴿وَلَمَّا جَاءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝﴾ (الزخرف : ۶۳)

"اور جب عیسیٰؑ صریح نشانیاں لیے ہوئے آیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ "میں تم لوگوں کے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان باتوں کی حقیقت کھول دوں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو، لہٰذا اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو"۔

دیکھئے، یہاں صرف ایک لفظ "حکمت" آیا ہے کہ "میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں"۔

انجیل، حکمت پر اور تورات احکام پر مشتمل ہے : میں یہ بات بتکرار و اعادہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن حکیم میں "آیات" بھی ہیں، یعنی دلائل و براہین بھی ہیں، اس میں حمد کے ترانے بھی ہیں، اس میں تزکیۂ نفس کا سامان بھی ہے، اس میں کتاب یعنی احکام بھی ہیں، اور اس میں حکمت بھی ہے، لیکن انجیل صرف حکمت اور تورات صرف احکام پر مشتمل ہے۔ اصل میں اب یہ بھی بڑی مشکل ہے کہ ہم تورات کہیں کسے؟ آج جو پانچ کتابیں عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی شمار ہوتی ہیں انہیں یہ لوگ "Five Books of Moses" تو کہہ دیتے ہیں لیکن یہ "تورات" نہیں ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تورات کسی حد تک ان پانچوں کتابوں کے اندر موجود ہے۔ اپنے زمانۂ طالب علمی میں مجھے اناجیلِ اربعہ، خاص طور سے متی کی انجیل سے بہت شغف ہو گیا تھا۔ اس میں شامل حضرت مسیحؑ کے "پہاڑی کے وعظ" (Sermon of the mount) سے مجھے بہت ہی دلی مناسبت ہے۔ اُن دنوں میں ساہیوال میں تھا (جو اُس وقت منٹگمری کہلاتا تھا) وہاں عیسائی مشن کا بہت بڑا مرکز ہے۔ ایک روز میں نے وہاں جا کر پادری سے اناجیل کے بارے میں یہ سوال کیا کہ Which one of them is Bible? یعنی تمہاری

چار انجیلوں (متی' مرقس' لوقا اور یوحنا) میں سے بائبل کونسی ہے؟ اس نے بڑا پیارا جواب دیا کہ "None of them is Bible;Bible is in them" یعنی "ان میں سے کوئی سی بھی بائبل نہیں ہے' بائبل ان میں ہے"۔ اسی طرح عہد نامۂ قدیم کی پانچ کتابوں میں سے کوئی سی بھی تورات نہیں ہے بلکہ تورات ان میں ہے۔

اس کی حقیقت اس طرح سمجھئے کہ نزولِ قرآن کے ابتدائی دور میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو احادیث لکھنے سے سختی سے منع کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ "لَاتَکْتُبُوا عَنِّی غَیْرَ الْقُرآن" (رواہ مسلم' عن ابی سعید الخدریؓ) یعنی "مجھ سے قرآن کے سوا اور کچھ مت لکھو"۔ اس لئے کہ اُس وقت قرآن اور حدیث کے باہم گڈمڈ ہو جانے کا امکان تھا۔ اگر اس وقت حضورؐ صحابہؓ کو اس سے منع نہ فرماتے اور بالفرض یہ صورت پیدا ہو جاتی کہ حضورؐ نے جو قرآن سنایا وہ بھی ایک صحابیؓ نے اپنے پاس درج کر لیا' حضورؐ نے کوئی وعظ یا خطبہ ارشاد فرمایا تو اسے بھی نقل کر لیا' پھر سیرت کا کوئی واقعہ آیا تو اسے بھی ساتھ ہی نوٹ کر لیا' تو اس طرح ساری چیزیں باہم گڈمڈ ہو جاتیں۔ دین محمدیؐ چونکہ آخری دین تھا اور قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آنے والی نہیں تھی' لہٰذا اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہوا۔ چنانچہ "قرآن" علیحدہ ہے جو "وحی بِاللّفظ" (Verbal Revelation) ہے' حدیثِ نبویؐ علیحدہ ہے اور سیرت کی کتابیں علیحدہ ہیں۔ اس طرح یہ تینوں Categories ہمیشہ کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اگر کہیں خدانخواستہ آپ آج بھی اس طرح کریں کہ تینوں کو گڈمڈ کر دیں' مثال کے طور پر سورۃ الانفال میں جہاں غزوۂ بدر کا ذکر ہو رہا ہے وہاں آپ متن قرآنی کے ساتھ ہی سیرت ابن ہشام یا سیرت ابن اسحٰق سے اس غزوہ کے واقعات بھی درج کر دیں اور اسی میں اس غزوہ سے متعلق حضورؐ کے اقوال بھی شامل کر دیں تو یہ ایک نئی شے وجود میں آ جائے گی۔ بعینہٖ یہی حقیقت عہد نامۂ قدیم کی پانچ کتابوں کی ہے کہ ان میں تورات بھی ہے' حدیثِ موسویؑ بھی ہے' سیرتِ موسویؑ بھی ہے اور تاریخ بنی اسرائیل بھی۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو وہ چیز بھی پہنچا رہے تھے جو ان پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی' اپنی تقریریں اور وعظ و نصیحت بھی فرماتے تھے' پھر ان کی اپنی

زندگی کے واقعات بھی تھے' یہ سب جمع ہو گئے۔ چنانچہ پانچوں کتابوں کے اندر یہ سب کچھ گڈمڈ ہے۔ اسی طرح اناجیل کے اندر بھی یہی چیزیں ہیں۔ حضرت مسیحؑ پر جو وحی ہو رہی تھی وہ بھی ان میں ہے' اور اس کے ساتھ حضرت مسیحؑ کے اپنے مواعظ اور آنجنابؑ کے حالاتِ زندگی بھی ان میں شامل ہیں۔ گویا کتاب اللہ + حدیثِ نبوی + سیرت + تاریخ' یہ چار چیزیں جمع ہو کر حضرت مسیح علیہ السلام کے ضمن میں اناجیلِ اربعہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں تورات کی پانچ کتابیں بنتی ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں یہ سب چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ کتاب اللہ علیحدہ سے محفوظ ہے' حدیث نبوی ﷺ کے مجموعے الگ ہیں' سیرت الگ سے مرتب صورت میں موجود ہے اور تاریخ کی کتابیں علیحدہ ہیں۔

<u>قرآن -- جامع ترین آسمانی کتاب</u> : ایک اعتبار سے قرآن مجید ان سب چیزوں کا جامع بھی ہے' اس میں یہ چاروں چیزیں بھی موجود ہیں اور پھر یہ چاروں چیزیں علیحدہ علیحدہ حدیث' سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں بھی ہمیں مل جاتی ہیں۔ قرآن حکیم میں سیرت بھی ہے' مثلاً غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں۔ اس اعتبار سے انجیل و تورات اور قرآن میں بنیادی فرق ایک تو یہ ہے جو میں نے ابھی بیان کیا' اور دوسرا فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا جو تدریجاً ارتقاء ہو رہا تھا اس کے اعتبار سے شروع میں صرف اوامر و نواہی (Dos and Donts) دیئے گئے۔ اصل تورات تو صرف وہ احکام تھے جو پتھر کی الواح پر لکھے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے یعنی "اَحکامِ عشرہ" (The Ten Commandments)۔ باقی تو حضرت موسیٰؑ کے مواعظ' سیرتِ موسویؑ اور تاریخ بنی اسرائیل کو جمع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ عہد نامہ قدیم کی پانچ کتابوں میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ زبور صرف حمد کے ترانوں پر مشتمل تھی۔ قرآن مجید میں بھی حمد کے ترانے جا بجا ملتے ہیں۔ بلکہ حمد کے حوالے سے قرآن حکیم میں میں نے ایک عجیب نکتہ نوٹ کیا ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن میں تقریباً سات سات پاروں کے بعد سورتوں کے آغاز میں "الحمد" کا لفظ آتا ہے۔ قرآن حکیم کی ابتداء میں سورۃ الفاتحہ کا آغاز ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ سے ہوتا ہے۔ ساتویں پارے میں سورۃ الانعام

کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے : ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ پھر پندرہویں پارے میں سورۃ الکہف کا آغاز ان پُرشکوہ الفاظ سے ہوتا ہے : ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ پھر اس کے بعد بائیسویں پارے میں "الحمد" سے شروع ہونے والی دو سورتیں' سورۂ سبا اور سورۂ فاطر جڑواں طور پر آگئی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اخیر کا حق بھی وہیں پر ادا کر دیا گیا ہے۔ ان مقامات کے علاوہ بھی قرآن مجید میں حمد کے ترانے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اور یہ حمد آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ تو زبور میں صرف حمد کے ترانے ہیں' احکام نہیں ہیں۔ اور انجیل صرف حکمت و دانائی پر مشتمل ہے' جو دین کے باطنی پہلو سے متعلق ہے۔ دین کا ایک ظاہری پہلو ہے جس سے ہمارے ہاں علمِ فقہ بحث کرتا ہے اور دین کے باطنی پہلو کو ہمارے ہاں تصوف کا دائرہ قرار دے دیا گیا ہے۔ نماز کی ایک ظاہری ہیئت ہے کہ تکبیر تحریمہ اس طرح کہی جائے گی' قیام اس طرح کیا جائے گا' ہاتھ اس طرح باندھے جائیں گے' رکوع اس طرح ہوگا' سجدہ یوں کیا جائے گا وغیرہ' اور ایک اس کی باطنی کیفیت ہے جو مطلوب ہے' یعنی خشوع و خضوع اور حضورِ قلب۔ سجدہ کرو تو ایسے محسوس ہو کہ اپنے رب کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے۔

تعلیمِ مسیحؑ کے ضمن میں چار قرآنی الفاظ کا مفہوم

اس معنی میں یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآن حکیم میں جو یہ چار الفاظ دو مقامات پر آئے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ سورۃ المائدہ کے الفاظ ہیں : ﴿اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ﴾ یعنی "اے مسیحؑ یاد کرو جبکہ میں نے تمہیں سکھائی کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل"۔ اور سورۂ آل عمران میں الفاظ آئے ہیں : ﴿وَیُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ﴾ یعنی "اور اسے اللہ سکھائے گا کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل"۔ دونوں مقامات پر بعینہٖ وہی چار الفاظ آئے ہیں اور ان کے درمیان بظاہر "واو" آیا ہے جسے

عام طور پر واوِ عطف شمار کرلیا گیا ہے' اور اسی لئے میں نے بھی ترجمہ "اور" کے ساتھ ہی کیا ہے (کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل) لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں مقامات پر پہلا اور تیسرا "و" واوِ عطف ہے اور درمیان میں دوسرا "و" واوِ تفسیری ہے۔ گویا اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ "سکھائے گا اس کو / جبکہ میں نے تمہیں سکھائی کتاب بھی اور حکمت بھی یعنی تورات بھی اور انجیل بھی"۔ اس لئے کہ تورات صرف "کتاب" (بمعنی احکام) ہے اور انجیل صرف "حکمت" ہے۔ جبکہ قرآن حکیم عناصر چہارگانہ کا حامل ہے :

﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے آپ کو "وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ" قرار دیا ہے۔ یہ الفاظ سورۃ المائدہ کی آیت ۴۸ میں آئے ہیں :

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾

"(اے محمد ﷺ) ہم نے آپ پر جو کتاب نازل کی ہے' یہ کتاب میں سے جو کچھ پہلے نازل ہو چکا تھا اس کی تصدیق بھی کر رہی ہے اور اس پر محافظ و نگران اور حاکم بھی ہے"۔

قرآن حکیم میں "مُهَيْمِن" کا لفظ صرف دو مرتبہ آیا ہے۔ ایک زیر نظر مقام پر قرآن کے لئے اور دوسرے سورۃ الحشر کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے ذیل میں : ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾ اور "مُهَيْمِن" کے لفظی معنی میں امین ہونا' غالب ہونا' محافظ ہونا' نگہبان ہونا اور حاکم ہونا کا مفہوم ہے۔ قرآن ان تمام کتابوں کا جامع بھی ہے' محافظ بھی ہے' نگران بھی ہے' حاکم بھی ہے۔ یہ قرآن کی شان ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان سب اجزاء کو جمع کر دیا جو باقی تینوں کتابوں میں آئے تھے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا پچھلی کتابوں میں کتاب کا مصداق تورات اور حکمت کا مصداق انجیل ہے' جبکہ حمد کے ترانے زبور میں ہیں --- اور یہ تینوں اجزاء اس آخری کتاب میں جمع ہو گئے ہیں۔ "وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ" کے مصداق یہ تمام سابقہ کتب سماویہ کی نگران بھی ہے' امین بھی ہے' محافظ بھی ہے اور حاکم

بھی ہے۔

تعلیماتِ مسیحؑ اور تعلیماتِ نبویؐ میں مطابقت

اب میں حضرت مسیح علیہ السلام اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں مطابقت اور مماثلت کی چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی عدم تشدد کی تعلیم کے بارے میں ہمارے واعظ حضرت اکثر غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بڑی غیر فطری تعلیم ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپؑ کی یہ تعلیم آپؑ کی جدوجہد کے ایک خاص دور سے متعلق تھی۔ سیرتِ نبویؐ کے اس دور سے متعلق بعینہٖ یہی تعلیم محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ کیا مکہ میں انتقام' قصاص اور بدلہ لینے کی اجازت تھی؟ نہیں! بلکہ تعلیم یہ تھی کہ چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں' تمہیں زندہ جلا دیا جائے' تم جوابی کارروائی نہیں کرو گے! یہ ہر انقلابی جدوجہد کا ایک مخصوص مرحلہ ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ' خدانخواستہ' جیسا کہ قریش نے سازش کی تھی' رسول اللہ ﷺ قتل ہو جاتے یا بالفرض آپؐ کو بھی زندہ آسمان پر اٹھا لیا جاتا تو ظاہر ہے کہ بات بس یہیں تک رہتی' اگلا مرحلہ کہاں آتا؟ وہ جہاد و قتال کے مرحلے اور بدر و حنین کے معرکے کیونکر پیش آتے؟ تو حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی جدوجہد کے پہلے مرحلے میں عدم تشدد کی جو تعلیم دی وہ ان حالات میں صد فی صد درست تعلیم تھی۔ اسی تعلیم کی جھلک ہمیں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث میں بھی ملتی ہے۔ ایک حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: ((اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ)) "میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے"--- اور ان میں سے تین باتیں آپؐ نے یہ فرمائیں: ((وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ' وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ' وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ)) یعنی "جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں' جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں' اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں"۔ اب دیکھئے اس میں قصاص اور بدلے کی تعلیم کہاں ہے؟ تو کیا یہ' معاذ اللہ' خلافِ فطرت تعلیم ہے؟ یہ تو ایک حکیمانہ تعلیم ہے۔ یہ اسلام کی روحانی تعلیم ہے جس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ قانون نہیں ہے' قانون وہی رہے گا جو قرآن میں بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ "اے ہوشمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے"۔ لیکن اگر آپ بدلہ لینے پر قادر ہوں، پھر بھی معاف کردیں تو اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ: ۴۳) "البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے"۔ قدرت رکھنے کے باوجود معاف کردینے سے انسان کو ناقابلِ بیان لذت محسوس ہوتی ہے اور بڑا روحانی ترفع حاصل ہوتا ہے۔ تو یہ روحانیت اور حکمت کی تعلیم ہے، بلند مراتب کے حصول کی تعلیم ہے جو دی جارہی ہے۔ میں ہمیشہ بیان کرتا رہا ہوں کہ مکہ میں بارہ برس تک "Order of the day" یہی تھا کہ ہر طرح کے تشدد کو کسی مزاحمت کے بغیر برداشت کرو! یہی بات حضرت مسیحؑ کہہ رہے ہیں کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیردے!" (متی: ۵-۳۹)

میں نے اپنی پوری زندگی میں آج تک جو مواعظ پڑھے ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے "پہاڑی کے وعظ" (Sermon of the mount) سے زیادہ دلپذیر اور مؤثر کوئی وعظ نہیں پڑھا۔ یہ مفصل وعظ متی کی انجیل کے پانچویں باب سے شروع ہوتا ہے۔ اس وعظ کے چند ابتدائی جملے ملاحظہ کیجئے:

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی ان ہی کی ہے۔
مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔
مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔
مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہ آسودہ رہیں گے۔
مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔
مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے"۔

ان کو پڑھتے ہوئے آدمی بظاہر یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید یہ بدھ مت کے بھکشوؤں کو تعلیم دی جارہی ہے۔ اسلام کی تعلیم میں تو جہاد و قتال لازمی اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں: ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ "اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں

ان لوگوں کے ساتھ جو تم سے جنگ کرتے ہیں"۔ لیکن درحقیقت یہ چیزیں اتنی نمایاں ہو گئی ہیں کہ دوسری چیزیں سرے سے نگاہوں سے اوجھل ہیں' حالانکہ وہ بھی ہمارے دین میں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں موجود ہیں۔ آپ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس میں اور حضرت مسیحؑ کے مواعظ میں کس قدر کامل مطابقت ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی آنحضور ﷺ کی ایک دعا کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِی مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِی مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِی فِی زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) "اے اللہ! مجھے مسکین ہی زندہ رکھ' مسکینی کی حالت ہی میں مجھے موت آئے' اور قیامت کے روز تو مجھے زمرۂ مساکین میں اٹھائیو!" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہیں حضور ﷺ کو یہ دعا مانگتے سن لیا تو آپؐ سے سوال کیا: لِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ "کیوں؟ اے اللہ کے رسولؐ!" (آپؐ مسکینی کی یہ دعا کس لئے مانگ رہے ہیں؟) قَالَ: ((اِنَّھُمْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِاَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا)) آپؐ نے فرمایا: "یہ مساکین دولت مندوں کے مقابلے میں چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے"۔ ((یَا عَائِشَۃُ لَا تَرُدِّی الْمِسْکِیْنَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ)) "اے عائشہؓ' کبھی کسی مسکین کو خالی ہاتھ واپس نہ لوٹانا' چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی تمہارے پاس ہو تو وہی اس کو دے دینا!" ((یَا عَائِشَۃُ اَحِبِّی الْمَسَاکِیْنَ وَقَرِّبِیْھِمْ یُقَرِّبْکِ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) "اے عائشہ: مسکینوں سے محبت کرنا اور انہیں اپنے سے قریب رکھنا' تمہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنا قُرب عطا فرمائے گا"۔ تو یہ وہ تعلیم ہے جو ہمارے ہاں نظروں سے اوجھل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم میں سے بعض غیر محتاط لوگ حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو خلافِ فطرت قرار دے دیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' قرآن مجید جامع ترین کتاب ہے اور اس میں آیات' احکام' حکمت اور تزکیہ ساری چیزیں جمع ہیں' پھر یہ سابقہ کتبِ سماویہ پر مُھَیْمِن یعنی نگران و نگہبان بھی ہے اور بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس میں قانونی تعلیمات کے ساتھ ساتھ روحانی تعلیمات بھی ملتی ہیں۔

میں نے آغازِ خطاب میں یوحنا کی انجیل کا حوالہ دیا تھا۔ اس میں حضرت یوحنا کا یہ جملہ ملاحظہ کیجئے :

"اس لئے کہ شریعت تو موسیٰ کی معرفت دی گئی مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی"۔ (یوحنا : ۱-۱۷)

یعنی قانونِ شریعت تو ہمیں موسیٰؑ کے ذریعے دیا گیا لیکن حقیقت الحقائق "گہرائی اور حکمت در حقیقت مسیحؑ کے ذریعے آئے ہیں۔ ان ہی دو چیزوں کے لئے قرآن حکیم میں "کتاب" اور "حکمت" کے الفاظ آئے ہیں۔ "کتاب" سے مراد احکام ہیں اور "حکمت" نام ہے ذہن و فکر اور فہم کی گہرائی کا، روحانیت اور حقائق باطنی تک رسائی کا، اور دین کے اندرونی پہلو (Esoteric Element) کا۔ چنانچہ تورات "کتاب" ہے اور انجیل "حکمت" ہے۔ اور اگر آپ انجیل کی تعلیمات کا احادیثِ نبویؐ سے تقابل کریں گے تو آپ کو ان کے مابین مماثلت اور مطابقت نظر آئے گی۔ اس لئے کہ قانون تو انجیل میں ہے ہی نہیں۔ وہ تو خود حضرت مسیحؑ نے فرمادیا تھا کہ :

"یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں"۔ (متی : ۵-۱۷)

یعنی میں شریعتِ موسوی کو منسوخ کرنے نہیں آیا، شریعت تو وہی رہے گی۔ اسے تو سینٹ پال نے منسوخ قرار دیا، جبکہ حضرت مسیحؑ کا مذکورہ بالا قول آج بھی انجیل میں موجود ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ انجیل میں بہت کم تحریف ہوئی ہے۔ اناجیلِ اربعہ (متی، مرقس، لوقا اور یوحنا) کی حد تک مجھے تو ان میں کوئی گمراہ کن نظریات یا غلط عقائد نظر نہیں آئے۔ یہ ضرور ہے کہ انجیل کا متن اس طرح کا تو نہیں ہے جیسے قرآن کا ہے کہ وہ لفظاً اور حرفاً محفوظ ہے۔

حدیثِ نبویؐ سے انجیل کی مشابہت کی ایک چھوٹی سی مثال اور ملاحظہ کیجئے۔ انجیل میں طلاق کے بارے میں حضرت مسیحؑ کے الفاظ نقل ہوئے ہیں :

(تورات میں) "یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو اپنی بیوی کو چھوڑے اسے طلاق نامہ لکھ کر دے۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑے وہ اس سے زنا کراتا ہے"۔ (متی : ۵-۳۱، ۳۲)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے قول کو نقل کرنے میں کہیں ذرا لفظی اونچ نیچ ہو گئی ہے' ورنہ حقیقت کے اعتبار سے آپؑ کی بات بالکل درست ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگرچہ ہماری شریعت میں قانون کے اعتبار سے طلاق جائز ہے' لیکن حدیث میں اس کے لئے بڑے سخت الفاظ آئے ہیں : ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ)) (ابوداؤد' عن ابن عمرؓ) یعنی "اللہ تعالیٰ کو حلال چیزوں میں سب سے زیادہ نفرت طلاق سے ہے"۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں طلاق کے لئے "اَبْغَض" کا لفظ آیا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مبغوض ترین چیز ہے۔ بغیر کسی حقیقی سبب کے عورت کو طلاق دے دینا انتہائی ظلم ہے۔ اور بعض جگہ تو طلاق کو محض عیاشی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یعنی پہلے سے چار بیویاں موجود ہیں اور کسی پانچویں پر دل آگیا تو ایک بیوی کو طلاق دے دی تاکہ پانچویں اپنے حبالۂ عقد میں آجائے۔ ہمارے عرب ممالک کے امراء و شیوخ یہی کچھ تو کرتے ہیں۔ اور پھر بڑے بڑے حرم بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جو عورت کچھ عرصہ کسی امیر کی بیوی رہی ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے کسی اور کی زوجیت میں جانے کی اجازت دے دے۔ اب وہ بے چاری وہاں اس حال میں رہے گی کہ نہ وہ شوہر والی ہے اور نہ دوسری شادی کرنے کے لئے آزاد ہے۔ بس اسے نان نفقہ ملتا رہے گا اور وہ ایک "Human Vegetable" بن کر زندگی گزار دے گی۔ اب ظاہر بات ہے کہ ایسی کسی عورت سے اگر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے تو اس کا ذمہ دار وہی شخص ہو گا جس نے اس کو طلاق دی ہے۔ یہ بات تھی جو حضرت مسیحؑ نے کہی تھی جسے عیسائیوں نے قانون کا درجہ دے دیا' حالانکہ حضرت مسیحؑ نے خود فرمادیا تھا کہ قانون تو تورات کا رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ طلاق کے بارے میں جو بات آنحضور ﷺ نے فرمائی تھی تقریباً وہی بات حضرت مسیحؑ نے فرمائی۔ گویا کہ ایسی عورت کی بدکاری کا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے اسے طلاق دی۔

میرے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور احادیثِ نبویؐ کے تقابلی مطالعے اور ان کے مابین مطابقت تلاش کرنے کی گہری ضرورت ہے' تاکہ ہمارے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ان غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو سکے کہ حضرت مسیحؑ کی تعلیمات غیر فطری ہیں۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کے بارے میں یہ روایت میں نے بارہا سنائی ہے جو منفصل یا منقطع

نہیں بلکہ متصل روایت ہے۔ یعنی مجھ سے جناب میم شین نے بیان کیا، انہیں سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان نے بتایا اور ان سے خود مہاتما گاندھی نے یہ بات کہی کہ میں نے عدم تشدد حضرت مسیح اور حضرت محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) سے سیکھا ہے۔ اس اعتبار سے اسے خلافِ فطرت کہنا درست نہیں ہے بلکہ عدم تشدد کی تعلیم دراصل انقلابی جدوجہد کے ایک خاص دور میں ناگزیر ہوتی ہے۔ اسے اس خاص تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی انقلابی تحریک میں ایک مرحلہ صبرِ محض (Passive Resistance) کا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر ایک مرحلہ "اِقدام" (Active Resistance) کا آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد جب "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہوئی تب حکم دیا گیا کہ "اب جنگ کرو ان سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں" اور "ان کو قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا" لیکن صرف جہاد و قتال کے ان احکام ہی کو نہ دیکھئے۔ یہ بھی دیکھئے کہ مکہ میں کیا حکم تھا؟ یہ کہ: "کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ" (اپنے ہاتھ بندھے رکھو!) دشمن مار رہا ہے تو مار کھاؤ، لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ! وہی طرزِ عمل اختیار کرو جو حضرت ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کے مقابلے میں اختیار کیا تھا اور کہا تھا: ﴿لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ﴾ یعنی "اگر تم اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لئے بڑھاؤ گے تو بھی میں اپنا ہاتھ تمہیں قتل کرنے کے لئے نہیں بڑھاؤں گا"۔ یہی طرزِ عمل شہیدِ مظلوم، خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اُس وقت اختیار کر کے دکھایا جبکہ آپؓ ذوالقرنین کی مملکت سے کم از کم تین گنا بڑی مملکت کے فرمانروا تھے، ان کے صرف ایک حکم پر لاکھوں کی تعداد میں فوجیں آ سکتی تھیں، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی طرف سے مسلسل پیغام آ رہے تھے، شام کی فوجیں تیار کھڑی تھیں کہ آپؓ اجازت دیں تو ان مٹھی بھر سبائیوں کو پیس کر رکھ دیں۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ میں اپنی جان کے تحفظ کے لئے کسی کلمہ گو کا خون بہانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس لئے کہ یہ "کلمہ گو" تو ہیں، جھوٹے ہیں یا سچے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرے گا۔ ان کے دل میں کیا ہے، وہ میں نہیں جانتا۔ البتہ اگر یہ مجھے قتل کر دیں تو پھر تم ان سے قانون کے مطابق قصاص لینا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ اگر "صبرِ

محض" کو "اقدام" کے مقابلے میں اور "اخلاقی و روحانی تعلیمات" کو "قانون" کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے تو اناجیلِ اربعہ میں حدیثِ نبویؐ کے ساتھ بڑی کامل مشابہت اور مطابقت نظر آئے گی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں صرف اناجیلِ اربعہ کی بات کر رہا ہوں' عیسائیت میں بعد میں در آنے والی سینٹ پال کی تعلیمات کا ذکر نہیں کر رہا۔ اس لئے کہیں آپ کسی مغالطے کا شکار نہ ہو جائیں۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات OO

رفقاء و احباب مطلع رہیں کہ ان شاء اللہ العزیز

تنظیم اسلامی کا

بیسواں سالانہ اجتماع

جمعۃ المبارک ۲۰/ اکتوبر تا اتوار ۲۲/ اکتوبر ۹۵ء

بمقام **مینار پاکستان** منعقد ہو گا!

اسی موقع پر

احیاءِ خلافت کانفرنس

کا انعقاد بھی کیا جائے گا!

جہاد کا اعلان کیجئے' اور

لوگوں کو بیعتِ جہاد کی دعوت دیجئے!

قاضی حسین احمد' امیر جماعت اسلامی کے نام ایک کھلا خط

مکتوب نگار : جناب عبدالرزاق

زیر نظر مکتوب جس کی ایک ایک سطر میں خلوص و اخلاص اور جذبۂ صادق کی مہک رچی بسی ہوئی ہے' تنظیم اسلامی کی مرکزی ٹیم کے ایک اہم رکن محترم عبدالرزاق صاحب نے جو اُن دنوں ناظم حلقہ لاہور کے طور پر ایک اہم تنظیمی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے' اپنی ذاتی حیثیت میں امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد کے نام تحریر کیا تھا۔ وہ ایک عرصہ قاضی صاحب کی طرف سے جواب کے منتظر رہے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!--- اب ڈیڑھ سال بعد اسے افادۂ عام کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

۲۰/مارچ ۱۹۹۴ء

محترم قاضی حسین احمد صاحب

امیر جماعت اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' مزاج گرامی!

آپ کی خدمت میں چند گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔ میری آپ سے استدعا ہے کہ ان پر ضرور غور فرمایئے گا۔

اس وقت ہمارا ملک اندرونی طور پر جس خوفناک بحران کا شکار ہے اور بین الاقوامی

سطح پر جس طرح تنہا اور بے بس ہوتا جارہا ہے اس کا آپ کو خوب اندازہ ہو گا۔ اگر کیفیت یہی رہتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جلد ہی اہل پاکستان پر خدانخواستہ کوئی بہت بڑی مصیبت وارد ہو سکتی ہے۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لئے ایک فوری لائحہ عمل ہے جو میں پورے اخلاص کے ساتھ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ یہاں میں صرف اجمالاً اشارات پر اکتفا کروں گا۔ وضاحت کے لئے اگر آپ فرمائیں گے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لائحہ عمل درج ذیل ہے۔

۱۔ پاکستان کے موجودہ فاسد اور ظالمانہ نظام کو تبدیل کرنے کے لئے جہاد کا اعلان کیجئے اور لوگوں کو پکاریئے کہ وہ آپ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کریں۔ مجھے یقین ہے کہ تمام دینی جماعتوں کے بے شمار مخلص افراد آپ کے دستِ مبارک پر بیعت جہاد کرنے کے لئے حاضر ہو جائیں گے۔

۲۔ الیکشن کی سیاست سے کم از کم دس سال کے لئے کنارہ کش ہونے کا اعلان کر دیجئے۔

۳۔ پورے پاکستان سے بیعتِ جہاد کرنے والے حضرات کی تعداد جب دو لاکھ ہو جائے' اور میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ صرف چھ ماہ میں اتنی تعداد میں لوگ بیعتِ جہاد کر لیں گے' تو انہیں لے کر کھلے میدان میں اجتماعی توبہ کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور میں حاضر ہو جائیں' جہاں سب افراد پہلے انفرادی اور پھر اجتماعی طور پر آپ کی قیادت میں اللہ سے

i) اپنے سابقہ گناہوں کی صدق دل سے معافی مانگیں

ii) آئندہ کیلئے پوری زندگی میں اللہ کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا عزم کریں---

اور

iii) اللہ کے دین کے قیام کیلئے ضرورت پڑنے پر جان کا نذرانہ پیش کرنے کا عہد کریں

۴۔ اس کے بعد چھ ماہ میں ان کا نظمِ سمع وطاعت قائم کر کے ان کی بنیادی تربیت مکمل کر لی جائے۔

۵۔ اس تربیت کے دوران ان کی اس مشن کے ساتھ تعلق کی گہرائی کا اندازہ کر کے درجہ

بندی کرلی جائے۔

۶ ۔ اور پھر جب آپ محسوس کریں کہ یہ دو لاکھ فدائین کی قوت منظم بھی ہو گئی ہے اور سمع و طاعت کی عادی بھی بن گئی ہے تو اللہ کا نام لے کر اسے میدان میں لے آئیں اور موجودہ فرسودہ اور ظالمانہ نظام کے خلاف علم جہاد بلند کردیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ موجود الوقت حکومت سے دین کے مکمل نفاذ کا مطالبہ کیا جائے اور اسے ایک مقررہ مدت' جو ایک ماہ یا کم و بیش ہو سکتی ہے' کی مہلت دی جائے۔ اس مدت کے ختم ہونے پر اگر حکومت اس مطالبے کو پورا کرنے میں ناکام رہتی ہے تو اس حکومت کے خلاف مظاہروں اور گھیراؤ کا آغاز کیا جائے۔ مثلاً سودی اداروں یعنی بینکوں کا گھیراؤ کرکے پورے نظام کو مفلوج کردیا جائے۔ اس کے نتیجے میں حکومت کی جانب سے ہونے والے ہر قسم کے تشدد کو نہایت صبر سے برداشت کیا جائے' یہاں تک کہ اگر گولیاں بھی چلائی جائیں تو انہیں بھی خندہ پیشانی سے فدائین اپنے سینوں پر کھائیں اور شہادت کے بلند ترین منصب کو حاصل کرتے جائیں۔ اسی خون کی قربانی کے نتیجے میں نظام کی تبدیلی کی راہ ہموار ہو گی جیسے ایران میں ہوا۔ اس کے سوا بظاہر اس فرسودہ نظام کی تبدیلی کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم

۷ ۔ اس راہ میں اگر میری جان کا نذرانہ رب العالمین قبول فرمالے تو یہ میرے لئے بہت بڑی سعادت اور دلی خواہش کی تکمیل ہو گی۔

فقط والسلام مع الاکرام

عبدالرزاق

۴/۱ اے مزنگ روڈ لاہور

ضرورت رشتہ

رفیق تنظیم اسلامی ضلع غربی کراچی جو کہ صوبائی محکمہ میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہیں' دو لڑکیوں کے رشتے کے خواہشمند ہیں۔ دونوں صاحبزادیاں بالترتیب انٹر اور میٹرک پاس' صوم و صلوٰۃ کی پابند' امور خانہ داری' سلائی کڑھائی میں مہارت کے ساتھ پرائمری اسکول میں ٹیچر ہیں۔ عمریں ۲۳۔۲۲ سال ہیں---- برائے رابطہ : دفتر تنظیم اسلامی حلقہ سندھ و بلوچستان

۱۱۔ داؤد منزل' نزد آرام باغ' شاہراہ لیاقت' کراچی

مولانا مودودی مرحوم اور انتخابات

حافظ عاکف سعید

مولانا مودودی نے ۱۹۴۱ء میں جب جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تو یہ کوئی اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں تھا بلکہ اس کے لئے انہوں نے سالہاسال کی محنت سے میدان ہموار کیا تھا۔ اپنے قلم کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے جدید' آسان فہم اور مدلل انداز میں دین کے مختلف گوشوں اور اہم امور کی تعبیر و تشریح کے ذریعے انہوں نے پڑھے لکھے طبقات کے ایک قابل ذکر حصے کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ان کی فکر انگیز اور بصیرت افروز تحریریں ایک بڑے حلقے میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ گویا انہوں نے ایک بھرپور قلمی جہاد کے ذریعے جماعت کے لئے فکری اساس فراہم کی تھی۔ ان کے پیش کردہ افکار دلائل و براہین سے آراستہ اور نہایت واضح ہوتے تھے۔ دیگر دینی جماعتوں میں جماعت اسلامی کا مابہ الامتیاز وصف یہی تھا۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی جماعت کو ایک اصولی انقلابی جماعت کے طور پر استوار کیا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ غلبہ دین کی منزل انقلابی طریق کو اپنا کر ہی سر کی جا سکتی ہے۔ اس اہم سوال کے جواب میں کہ "اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے؟" مولانا کا یہ دو ٹوک موقف نہایت مدلل اور لائق توجہ ہے کہ :

> "حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی' اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے۔ کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لئے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظام حکومت میں نہیں' صرف اس کی اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا' اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہو گا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔

جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو گا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی، جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے"۔ (اسلامی حکومت کیسے قائم ہوتی ہے)

تاہم انتخابات کے ذریعے نظام کی تبدیلی کے معاملے کو بھی وہ خارج از امکان قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے لئے ان کی شرائط نہایت کڑی تھیں۔ ملک کی عظیم اکثریت کے ذہن و فکر کی ایسی تبدیلی کہ جس کے نتیجے میں اس دینی جماعت کو الیکشن میں بھاری اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہو جائے اور حالات اس درجے سازگار ہوں کہ محض حکومت کی تبدیلی ہی نظام کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکے۔ مولانا کے نزدیک یہ امور انتخابات کے میدان میں اترنے کی اولین شرائط کا درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ مولانا کی ۱۹۴۵ء کی تحریروں سے یہ دو اقتباسات اس ضمن میں نہایت اہم ہیں:

"اصولی طریق کار یہی ہے کہ ہم پہلے اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت پر لبیک کہیں، منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آ جانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول میں ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہو گا۔ اس لئے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقہ کار (Method)

سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہر اقتدار (Substance of Power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے"۔

(ترجمان القرآن۔ رمضان' شوال ۶۴ھ۔ ستمبر اکتوبر ۴۵ء)

"الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لئے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم یہ طریق کار صرف اس صورت میں اختیار کریں گے جبکہ :۔

اولاً' ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لئے ہموار ہو جانا ہی عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لئے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً' ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگان ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً' انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔"

(بحوالہ ترجمان القرآن' محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۴۵ء)

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں جب ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ الیکشن کا مرحلہ آیا تو خلاف توقع مولانا مرحوم کی رائے یہ بنی کہ جماعت کو الیکشن میں حصہ لینا چاہئے۔ تاہم اس موقع پر جو الیکشن پالیسی جماعت اسلامی نے وضع کی وہ اپنی جگہ اعلیٰ اصول پسندی کا ایک شاہکار ہے۔ آج جماعت اسلامی نے اپنے ہی وضع کردہ اصولوں کو نظرانداز کرتے ہوئے درجہ بدرجہ جس پست سطح تک آ

چکی ہے اس کے تناظر میں ۱۹۵۱ء کی الیکشن پالیسی ایک عجوبے سے کم نہیں۔ تاہم یہ واضح رہنا چاہئے کہ ان تمام اصولوں سے دستبرداری یکلخت عمل میں نہیں آئی بلکہ مولانا مودودی مرحوم کے زیر امارت ہی جماعت نے بتدریج ان اصولوں سے صرف نظر شروع کر دیا تھا۔ اس الیکشن پالیسی کے نمایاں فیچر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

اس الیکشن پالیسی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں امیدواری اور پارٹی سسٹم کو طریق انتخاب کے امہات الخبائث قرار دے کر ترک کر دیا گیا۔ امیدواری کے بارے میں شدت کے ساتھ یہ کہا گیا کہ یہ حرام ہے اور اس کے جواز کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور پارٹی سسٹم کے بارے میں بھی یہ رائے قائم کی گئی کہ یہ بھی دراصل اجتماعی پیمانے پر امیدواری ہی کی ایک صورت ہے اور اس سے وہ تمام خرابیاں دوچند بلکہ سہ چند ہو جاتی ہیں جو امیدواری سے پیدا ہوتی ہیں۔

"جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد" نامی پمفلٹ میں جماعت کا یہ موقف نہایت واضح الفاظ میں یوں مذکور ہے :

> "رسول برحق کے یہ ارشادات بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے جن کی سچائی پر عقل عام گواہی دے رہی تھی۔ لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو امیدوار ہو اور اپنے لئے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب بھی اور جہاں کہیں سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے"۔ (جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد)

امیدواری اور پارٹی سسٹم کو حرام قرار دے کر جماعت اسلامی نے جو طریق انتخاب ایک "صالح قیادت" کو برسر کار لانے کے لئے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ جماعت اولاً ان حلقہ ہائے نیابت کو اپنی جدوجہد کے لئے منتخب کرے گی جن میں پہلے ہی سے اس کا اثر و نفوذ موجود ہے اور جہاں اس کے امکانات روشن ہیں کہ اگر محنت کی جائے تو کامیابی کی صورت پیدا ہو جائے۔ پھر ان حلقوں کے ووٹروں سے رابطہ قائم کیا جائے گا اور ان کے سامنے جماعت اپنے مقاصد کو وضاحت کے ساتھ پیش کرے گی۔ پھر جو ووٹر جماعت کے مقاصد سے اتفاق کر لیں گے ان پر مشتمل انتخابی پنچائتیں بنائی جائیں گی۔ ہر وہ ووٹر جو جماعت کی انتخابی جدوجہد سے متفق ہو یہ عہد نامہ پر کرے گا:

"اسلامی حکومت اور صالح قیادت چاہنے والے ووٹر کا عہد نامہ

میں ایک مسلمان پاکستانی ووٹر ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ جو حکومت خدا کی شریعت پر قائم ہو اور جس کا انتظام خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں ہو صرف اسی کے ہاتھوں سے بندوں کو انصاف اور چین نصیب ہو سکتا ہے' اس لئے میں اپنے ملک میں ایسی ہی حکومت چاہتا ہوں۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اچھی اور بری حکومت قائم ہونے میں میرے ووٹ کا بھی حصہ ہے۔ میں اچھے لوگوں کو ووٹ دوں گا تو اچھی حکومت قائم ہو گی اور اس کا اجر دنیا و آخرت میں مجھے بھی ملے گا۔ اور اگر میں نے برے لوگوں کو ووٹ دیا تو بری حکومت قائم ہو گی اور اس سے صرف دنیا ہی میں مجھے اور دوسرے بندگان خدا کو تکلیف نہیں پہنچے گی بلکہ آخرت میں بھی اس کی برائیاں میرے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

لہٰذا میں خدا کو حاضر ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ

(۱) میں ووٹ دینے میں ذاتی فائدے اور نقصان یا اپنی ذات اور برادری کے تعلقات کا لحاظ نہ کروں گا۔

(۲) میں صرف اس شخص کو ووٹ دوں گا جو اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں خدا اور رسول ﷺ کے احکام کا پابند ہو' جو اپنے لین دین میں ایماندار اور اپنے معاملات میں کھرا ہو' جو اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہو۔

(۳) میں کسی ایسے شخص کو ووٹ نہیں دوں گا جو خود امیدوار بن کر کھڑا ہو اور

ووٹ حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔

(۴) اگر مجھے کوئی نیک آدمی ووٹ دینے کے لئے نہ ملے گا تو میں سرے سے ووٹ ہی نہیں دوں گا۔

خدا مجھے اس عہد کو پورا کرنے کی توفیق دے، آمین" (ایضاً)

"صالح نمائندے" کی حسب ذیل نشانیاں" جماعت نے رائے دہندگان کے سامنے رکھیں:

"صالح نمائندے کی نشانیاں

اسلامی حکومت کو چلانے کے لئے آدمی میں یہ چار شرطیں پائی جانی ضروری ہیں۔

اول: یہ کہ وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنے گھر کی زندگی میں اسلام کا سچا پیرو ہو، وہ خدا کے عائد کئے ہوئے فرائض کو ادا کرتا ہو، وہ کھلے کھلے گناہوں کا مرتکب نہ ہو، اس کے گھر میں خدا کے قوانین علانیہ نہ توڑے جاتے ہوں۔

دوم: یہ کہ لوگوں نے اپنے تجربے میں اس کو ایک سچا، ایماندار اور کھرا آدمی پایا ہو۔ اس کی بستی کے عام لوگ اس بات کے گواہ ہوں کہ وہ ایک نیک انسان ہے۔ وہ جھوٹا اور بدمعاملہ آدمی نہ ہو، وہ حرام خور، ظالم اور دوسروں کا حق مارنے والا آدمی نہ ہو، وہ رشوتیں کھانے اور کھلانے والا نہ ہو۔ اس کا دامن لوٹ مار سے، ناجائز الاٹمنٹوں سے اور بلیک مارکیٹنگ سے پاک ہو۔

سوم: یہ کہ وہ دین اسلام سے بھی واقف ہو اور دنیا کے معاملات کی سمجھ بھی رکھتا ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑا عالم فاضل اور کسی دینی مدرسے کا سند یافتہ ہو۔ لیکن بہرحال اسلام کے اصولوں سے اس کا واقف ہونا ضروری ہے، کیونکہ جب تک وہ اسلام کو جانے گا نہیں آخر وہ ایک اسلامی نظام حکومت چلائے گا کیسے؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دنیا کے معاملات سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو، کیونکہ اس کے بغیر وہ آخر ان سیاسی، معاشی، تمدنی، تعلیمی، قانونی اور انتظامی مسائل کو کیسے سمجھے گا جن پر اسلام کے اصولوں کو منطبق کرنا ہے؟

چہارم: یہ کہ وہ جاہ طلب اور عہدے کا حریص نہ ہو۔ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں نہ آئے جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ اسمبلی میں جانے کے لئے خود کوشاں ہے"۔

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد)

۱۹۵۱ء کے پنجاب الیکشن کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن تھے مولانا مودودی کو کم و بیش تین سیٹوں کی توقع تھی، لیکن جماعت کا ایک نمائندہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ تھا کہ ابھی عوام الناس کے ذہن و فکر کی تبدیلی کا کام اس ادنیٰ ترین درجے میں بھی نہیں ہوا تھا کہ جس کے ہوتے ہوئے انتخابات کے راستے اقتدار میں آنے کا کوئی امکان پیدا ہو سکتا ہو۔ الیکشن سے پہلے اگر جماعت کی قیادت عظمیٰ نے حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں ٹھوکر کھائی تھی اور اپنے ملک کے عوام سے حسن ظن کی بنیاد پر بہت اونچی توقعات وابستہ کر بھی لی تھیں تو اس نوع کی غلطی بہرحال قابل درگزر ہی سمجھی جائے گی۔ اس لئے کہ اندازہ قائم کرنے میں غلطی کا ہو جانا بالکل قرین امکان ہے، تاہم یہ بات ہمارے نزدیک ناقابل فہم ہے کہ الیکشن کے نتائج نے جب تمام تر غلط فہمی دور کر دی تو اب الیکشن کے راستے سے دستکش ہونے میں کیا چیز مانع تھی؟ الیکشن کے انتہائی حوصلہ شکن نتائج سے سبق کیوں نہ سیکھا گیا؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مولانا کے ۱۹۴۵ء کے موقف کی روشنی میں جس کا ذکر "رسائل و مسائل" کے حوالے سے سطور بالا میں کیا جا چکا ہے الیکشن کی سیاست پر تین حرف بھیج کر ایک طویل المیعاد منصوبے کے تحت از سر نو انقلابی نہج پر دعوت و تطہیر افکار کا کام وسیع پیمانے پر کیا جاتا اور ان شرائط کو پورا کرنے کا خاطر خواہ اہتمام کرنے کے بعد ہی کہ جن کی نشاندہی مولانا مرحوم بڑے واضح الفاظ میں فرما چکے تھے، آئندہ کسی الیکشن میں شمولیت کے بارے میں سوچا جاتا۔ لیکن افسوس کہ جماعت کی قیادت نے جس میں خود مولانا مودودی مرحوم بھی شامل تھے، اپنے ہی اصولوں کو مسلسل نظر انداز کیا۔ الیکشن کی سیاست پر مسلسل اصرار کے نتیجے میں جماعت کی اصول پسندی کا جس طرح بتدریج مثلہ ہوا اس کا منطقی انجام گذشتہ انتخابات کے موقع پر سامنے آیا جب امیر جماعت اسلامی قاضی حسین احمد اور ان کی تنظیم پاسبان کے ہاتھوں جماعت کا وقار اور عزت اس درجے مجروح ہوئے کہ ارکان جماعت کی ایک عظیم اکثریت بھی چیخ اٹھی۔ کون نہیں جانتا کہ جماعت کے بزرگ ترین رکن اور مولانا مودودی مرحوم کے قریب ترین ساتھی اسی سبب سے جماعت سے علیحدہ ہوئے۔ نعیم صدیقی صاحب اکیلے ہی جدا نہیں ہوئے، ارکان جماعت کی ایک اچھی خاصی تعداد جماعت سے کٹ گئی۔

بہرکیف ہم سمجھتے ہیں کہ الیکشن کی سیاست میں عملی حصہ لینے کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کا ۱۹۴۵ء کا موقف آج بھی ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی جماعت اسلامی اگر اس اصول کو صحیح معنوں میں اپنانے کا فیصلہ کرے تو معاملہ بہت حد تک سدھر سکتا ہے۔

اللھم وفقھم لھذا OO

تجدید واحیائے دین کے عظیم کام کی اصل قیادت کا اعزاز آج تنظیم اسلامی کو حاصل ہو چکا ہے!

تحریک جماعت اسلامی نے اپنے اصل مقصد کو بہت حد تک پیچھے پھینک دیا ہے!!

تنظیم اسلامی اور تحریک جماعت اسلامی کے بارے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک نہایت سرگرم سابق کارکن شاہد مجید کے تأثرات' جو اَب تنظیم میں شامل ہیں

۱۷/ اگست ۹۵ء

امیر محترم' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'!

اللہ تعالیٰ سے آپ کی بہترین صحت اور ایمان کے لئے دعاگو ہوں۔ تنظیم اسلامی میں شامل ہوئے ۶ ماہ ہو گئے ہیں اور الحمدللہ دن بدن اس بات پر انشراح صدر حاصل ہو رہا ہے کہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر تنظیم اسلامی میں آنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ بلاشک وشبہ درست تھا۔ اگرچہ تنظیم میں شمولیت سے بھی پورا ایک سال قبل میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اقامتِ دین اور تجدید واحیائے دین کے عظیم کام کی اصل قیادت کا اعزاز اس وقت تنظیم اسلامی کو حاصل ہو چکا ہے اور جماعت اسلامی اب اس قیادت سے محروم ہو چکی ہے مگر پھر بھی اسلامی جمعیت طلبہ میں کچھ دیر مزید شمولیت کا فیصلہ یہ سوچ کر کیا کہ ایک مرتبہ اصلاح احوال کی کچھ کوشش ضرور کرنی چاہئے اور آپ کے بعض افکار و تجزیوں سے کم از کم جمعیت کی قیادت کو ضرور آگاہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اصلاح احوال کے لئے ایک سال مزید میں نے جمعیت میں گزارا اور یہ امید قائم رکھی کہ اصلاح ہو سکتی ہے مگر جب کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی تو میں ادھیڑبن میں پڑ گیا کہ کوشش جاری رکھوں یا چھوڑ دوں۔ اسی دوران آپ کی جانب سے میثاق میں میرا جو خط شائع ہوا اس نے میرے لئے مشکل فیصلے کو بہت

آسان کر دیا * ۔ اس خط پر جمعیت کی قیادت کا جو ردعمل سامنے آیا اور مجھے جس diplomatic انداز سے ذمہ داری سے فارغ کیا گیا اس سے مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ روایتی سیاست نے جماعت اور جمعیت کو ٹھوس انقلابی فکر اور تحریکی مزاج سے خاصا دور کر دیا ہے اور ان کے قائدین کے ذہن بہت کچھ سیاسی ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے تنظیم کے ٹھوس انقلابی افکار آسانی سے ہضم نہ ہو سکیں گے اور انکی بحیثیت مجموعی اصلاح تقریباً ناممکن ہے اور فراغت کے بعد یہ احساس بھی ہوا کہ جماعت اور جمعیت کے لوگ آپ کو جماعت کے اندر ایک سابقہ رکن سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہیں اور آپ کے تجزیوں اور مشوروں پر غور کرنے کی طرف مائل نہیں ہیں۔ بہرحال ایک متعدبہ تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جنہیں افہام و تفہیم کے ذریعے تنظیم کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے اور اپنے تئیں یہ کوشش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ میں نے جمعیت کے بعض قائدین کو جماعت کی خامیوں اور تنظیم کی پیش رفت سے آگاہ کر کے سوچنے کی دعوت دی ہے۔

تنظیم اسلامی کے پروگراموں اور تربیت گاہ میں شرکت کرنے کے بعد اور اس کا لٹریچر پڑھنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ الحمدللہ اس وقت فکری و عملی اعتبار سے تنظیم تمام دینی جماعتوں میں نمایاں مقام رکھتی ہے اور اس کی دعوت اور منہج عمل میں اتنی جان ہے کہ یہ تمام دینی جماعتوں کے مخلص کارکنوں کو اپنی طرف کھینچنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ جماعت اسلامی، دعوت اسلامی، تبلیغی جماعت، منہاج القرآن کے بہت سے افراد آہستہ آہستہ تنظیم میں شامل ہو رہے ہیں اور ان شاء اللہ تائید و نصرتِ خداوندی سے بہت جلد اس ضمن میں ایک "Flow" شروع ہو سکتا ہے۔ پہلے پہل تو رجوع الی القرآن، منہج انقلاب نبویؐ اور رجوع الی الخلافت کی پکار ہی کی بنیاد پر میں تنظیم اسلامی کو dominant سمجھتا تھا مگر اب یہ بات واضح ہوئی ہے کہ فرائض دینی کا جامع تصور اور بیعت کے نظام کا احیاء بھی بہت بڑے کارنامے ہیں۔ مزید برآں بدعات

---

* دسمبر ۹۴ء کے میثاق میں نام کی صراحت کے بغیر جمعیت کے جس سرگرم کارکن کا خط شائع ہوا تھا، اس کے تحریر کرنے والے یہی شاہد مجید صاحب تھے۔

و رسومات اور معاشی معاملات میں احتیاط و تقویٰ کے حوالے سے بھی تنظیم اسلامی کا ایک نمایاں کردار ہے اور جماعت اسلامی کے نظام تربیت میں جس باطنی و ایمانی تربیت کی کمی تھی اس خلاء کو بھی الحمدللہ یہاں بطریق احسن پُر کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہماری اجتماعیت ان تمام خوبیوں کے ساتھ جلد از جلد وسعت اختیار کر جائے۔

آج کل "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب اور "انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" کے ذریعے اس صدی میں تجدید و احیائے دین کی مساعی کی ایک پوری تاریخ مدون ہو گئی ہے اور قرآن کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکوں کے ضمن میں تو پچھلی دو صدیوں کے کام کا ایک جائزہ سامنے آ گیا ہے۔ بھرپور معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ بلاشبہ آپ مختصر اور جامع تجزیہ کرتے ہیں بلکہ میں اس کو "Mathematical Analysis" کہوں گا۔ کیونکہ آپ خوب ناپ تول اور غور و فکر کے بعد دو اور دو چار کی طرح بات پیش کرتے ہیں اور آپ کے تجزیے بہت درست ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان میں مزید برکت ڈالے۔

"دعوت رجوع الی القرآن" پڑھ کر بجا طور پر اس تحریک تعلم و تعلیم قرآن میں حصہ لینے کو جی چاہتا ہے، قرآن سے تعلق کی اہمیت اجاگر ہوئی ہے۔ اس کتاب اور ذاتی طور پر آپ کی ترغیب سے ایک سالہ کورس کے ذریعے قرآن سیکھنے کا زبردست داعیہ پیدا ہوا ہے اور میں اسی سال ان شاء اللہ اس کورس سے بہرصورت مستفید ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں، اگرچہ کچھ عرصے سے گھر والوں بالخصوص والد صاحب کی طرف سے Job کے لئے دباؤ ہے مگر میں Job سے پہلے یہ کورس کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس معاملے میں میرے لئے دعا کیجئے گا۔

اسی کتاب میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" والا مضمون دوبارہ پڑھنے کو ملا اور پھر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا مضمون پڑھ کر نہ صرف اس اہم علمی کام کی اہمیت واضح ہوئی بلکہ اس علمی کام کے حوالے سے concept مزید واضح ہوا۔ اس حوالے سے علمی کام کی دو سطحیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرنا اور دوسرے اسلام کے ایمانیات کو اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرنا۔ مزید

برآں قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی روشنی میں باطل افکار و نظریات کو رد کر کے نئے افکار پیش کرنا۔ اب تک تو زیادہ تر تحریکی لٹریچر ہی پڑھا ہے مگر مغربی تہذیب سے متعلق کچھ مطالعہ اور یہ دو مضامین پڑھ کر ان موضوعات کے مطالعہ کا بھی شوق پیدا ہوا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ باسط بلال صاحب نے اس ضمن میں کام شروع کر دیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک مختصر ملاقات میں انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے نشأۃِ ثانیہ کے پہلے دو باب مکمل کر لئے ہیں۔ اللہ کرے وہ اس کام کا بیڑا اٹھالیں اور یوں ایک سے دو اور دو سے چار کی طرح لوگ اس کام میں شریک ہوتے چلے جائیں گے۔ میری دعا ہے کہ اس ضمن میں آپ کی زندگی میں ہی باقاعدہ پیش رفت ہو۔ (علمی کام کے حوالے سے عہد حاضر میں نظام خلافت کے جو خدوخال آپ نے اپنے خطبات میں پیش کئے ہیں وہ بھی اہم کام ہے' براہ کرم ان کو جلد کتابی شکل میں شائع کیجئے)

اپنا ایک خط جو میں نے بحیثیتِ رکن' جمعیت کی شوریٰ اور جماعت اور جمعیت کے مختلف قائدین کو لکھا تھا' آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ آخر میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ سے آپ کی صحت اور کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ والسلام

شاہد مجید' رفیق تنظیم اسلامی' فیصل آباد

☆ ☆ ☆

تحریکِ اسلامی ــــــ تنظیمِ نو کی ضرورت

تحریک جماعت اسلامی کی موجودہ صورتحال کے بارے میں جماعت کے قائدین کے نام محترم شاہد مجید کا مفصل خط جو انہوں نے بحیثیت رکن جمعیت تحریر کیا تھا۔

گزشتہ چند برسوں سے تحریک اسلامی پاکستان جس جمود اور سستی کا شکار ہے اور اب جس تیزی سے انحطاط کا شکار ہو رہی ہے اس پر تحریک کی قیادت کو تمام معاملات کا بغور جائزہ لے کر صحیح لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے تاکہ تحریک کو فعال اور انقلابی بنایا جا سکے۔ اس ضمن میں شوریٰ کی خدمت میں چند گزارشات پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے شوریٰ ان پر

غور کرے گی۔

جمعیت کے ایک کارکن ہونے کے ناطے میں نے لٹریچر کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اور جتنا کچھ بھی اس عظیم نظریئے کو سمجھا' وہ اپنی بہترین شکل میں جمعیت اور جماعت میں نظر نہیں آیا۔ سستی' بے عملی' غیر سنجیدگی نظر آئی۔ باصلاحیت' ذہین اور دیندار طلبہ کا فقدان بھی محسوس ہوا۔ توجہ دعوتی سرگرمیوں کے بجائے سیاسی اور ٹیمپو سرگرمیوں کی طرف نظر آتی ہے۔ اب تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے مقصد کو بہت حد تک پیچھے پھینک چکے ہیں اور جو خرابیاں ہمارے اندر پیدا ہو چکی ہیں وہ بجائے دور ہونے کے بڑھتی جا رہی ہیں اور اس انداز میں رائج ہوتی چلی جا رہی ہیں کہ ہم آہستہ آہستہ ان کو accept کرتے جا رہے ہیں اور انہیں اپنی اجتماعیت میں برداشت کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ غیبت' تجسس' گروہ بندی' عدم اطاعتِ نظم' مادہ پرستی' دنیاداری' ہمارے اندر اب باقاعدہ رائج ہیں جبکہ تقسیم لٹریچر و مطالعہ' سٹڈی سرکل' انفرادی رابطہ' درس قرآن اور قرآن فہمی ایسے اہم اور بنیادی کام اب شدید متاثر رہنے کے بعد ہماری ترجیحات ہی سے دور ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ سیاسی سرگرمیوں' نعرے بازیوں' جلسوں' مہمات' استقبالئے' تفریحی ٹورز' مشاعرے' ٹیلنٹ شوز' سٹوڈنٹس فیئر' بک فیئر' ٹورنامنٹ اور سوسائٹیوں کو ہم نے نہ صرف اپنا لیا ہے بلکہ ان کو اپنے مزاج میں شامل کر لیا ہے۔ کہاں تو ان کو ہم نے دعوت اور رابطہ کا ذریعہ بنایا تھا اور کہاں ہم نے ان کو اپنی ترجیحات' مزاج اور رپورٹوں میں شامل کر لیا ہے۔ ان کے بغیر ہمارا اطمینان نہیں ہوتا' ہماری رپورٹ مکمل نہیں ہوتی' ہمارے کارکن فعال نہیں ہوتے' لوگ ہماری طرف نہیں آتے۔ چنانچہ اب تو عالم یہ ہے کہ یہ سرگرمیاں اتنی باقاعدگی سے ہمارے معمولات اور پلاننگ میں شامل ہو گئی ہیں کہ ہمارے افراد ان میں گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ لٹریچر' درس قرآن' سٹڈی سرکل کی بات ہو تو ہماری حاضری متاثر ہوتی ہے' تیاری نہیں ہوتی' یہ چیزیں خشک لگتی ہیں' مزاج کا حصہ نہیں بن پا رہیں' جبکہ تقریبات' استقبالئے' ٹور' ٹورنامنٹ ہوں تو تمام کارکنان سرگرم عمل ہو جاتے ہیں' پوری جمعیت Active نظر آتی ہے' بڑی حاضری ہوتی ہے اور ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ دعوت بڑے پیمانے پر پہنچ گئی۔ پھر پورا مہینہ آرام کیا جاتا ہے' کوئی انفرادی

رابطہ نہیں، کسی سے گفتگو نہیں، کوئی لٹریچر کی تقسیم نہیں۔ آخر اگلے ماہ بڑا پروگرام تو ہونا ہی ہے، اس میں ناظم اعلیٰ یا ناظم صوبہ کی تقریر ہو جائے گی، دعوت پہنچ جائے گی، یہ کام تو ہم نے بیسیوں سال کیا ہے، اب تو عوامی کام ہونا چاہئے، بہت تربیت ہو چکی، بڑا ٹیلنٹ اکٹھا ہو گیا، اب تو اقتدار میں آنے کی بات ہے۔ یہ وہ سوچ ہے جو بڑی شدومد کے ساتھ بن چکی ہے اور اب تو جمعیت کا کام الاٹمنٹوں، مسائل کے حل، ساتھیوں کے داخلوں، لڑائیوں، تھانوں اور کچہریوں میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ پھر ہم سوچتے ہیں کہ ہمارا کام متأثر کیوں ہے تو کوئی وجہ سامنے نہیں آتی! اِس وقت بہت بڑی تعداد میں ارکان کا مزاج خراب ہو چکا ہے۔ انہیں غلبۂ دین ایسے عظیم نظریئے کا کوئی شعور نہیں، وہ بس حالات کو دیکھتے ہیں اور ان کے مطابق اپنی مرضی سے غلط فیصلے کرتے ہیں۔ لٹریچر سے، سیرت النبیؐ سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔ بس ذہن کو یہ تسلی ہے کہ اسلام کا کام کر رہے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس کام کو اہل ہاتھوں کے سپرد کر کے رخصت ہونا ہے، پیچھے ہم کیا تیار کر رہے ہیں؟ یہ سوچنا ارکان کی ذمہ داری نہیں رہی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اب رفقاء سازی کس بنیاد پر ہو رہی ہے، مطالعہ کی بنیاد پر اور اسلام پسندی کی بنیاد پر اور نظریئے کو سمجھ کر یا جمعیت کو "قوت" سمجھ کر اور الاٹمنٹوں اور کام کروانے کے لئے، داخلے لینے کے لئے، مفادات کے لئے؟ آج رفقاء سازی تحفظ کے بغیر نہیں ہو پاتی۔ لوگ Protection مانگتے ہیں اور ہمارے افراد ان کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ گویا آنے والے دور میں انہیں لوگوں میں سے کچھ کو چھانٹ کر ہم رکن بنائیں گے اور اب بھی بنا رہے ہیں تو پھر معیار تو متأثر ہو گا! پھر مزید رفقاء ٹورنامنٹوں، ٹورز اور تقریبات میں رابطہ کے نتیجے میں بن رہے ہیں۔ ایسے پروگراموں میں دلچسپی لینے والا مزاج دعوتی سرگرمیوں کو کبھی پسند نہیں کرتا، وہ ٹیمپو چاہتا ہے، تفریح چاہتا اور جمعیت میں موجود ایسے مزاج کے افراد سے دوستیاں لگا لیتا ہے اور پھر گروپ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اسلحہ اور سیاسی قوت کی بنیاد پر بننے والے رفقاء کو صرف لڑائیوں اور ہنگاموں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کاموں میں خوب آگے اور نماز کا معاملہ ہو تو عدم دلچسپی، انہیں دعوت و تربیت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگ اکثر اوقات مخالفین سے لڑ پڑتے ہیں جس کے باعث پوری جمعیت کو لڑائی میں Involve ہونا پڑتا ہے۔

یہی لوگ لڑائیوں کے باعث نمایاں ہو جاتے ہیں اور عام لوگوں میں جمعیت کا تشخص خراب کرتے ہیں۔ یہ لوگ ضابطوں میں اپنے آپ کو کس کر نہیں رکھ سکتے۔ کھلے عام نظم پر تنقید کرتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، تجسس کرتے ہیں، یوں اندرونی ماحول کو بھی خراب کرتے ہیں۔ بڑی تعداد میں ایسے کارکنان اور رفقاء موجود ہیں جو خود موسیقی سنتے ہیں، سگریٹ پیتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں، مخلوط محفلوں میں بیٹھتے ہیں اور لڑائیوں میں آگے آگے رہتے ہیں اور پھر یہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ ہم تو بے پناہ قربانیاں دیتے ہیں، جان خطرے میں ڈالتے ہیں، جیلوں میں جاتے ہیں، یہ ارکان لوگ تو بس لیڈر ہیں، ناظم تو حکم چلاتا ہے، اصل کام تو ہم کر رہے ہیں۔ انہیں لوگوں سے جمعیت بھی پہچانی جاتی ہے اور ہم اپنی مصلحتوں کے باعث انہیں چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ نہی عن المنکر کے نام پر ہونے والی لڑائیوں میں اسی قبیل کے لوگ آگے آگے ہوتے ہیں جبکہ خود ان کاموں میں دلچسپی بھی لیتے ہیں۔ یوں جمعیت کا تشخص شدید مجروح ہو رہا ہے اور ہم اس سب کچھ کو برداشت کر رہے ہیں اور "مصلحتاً" خاموش ہیں۔ اجتماعیت میں باہم اصلاح کرنا، توجہ دلانا، احتساب کرنا ایسی عظیم روایات اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ کم مطالعے کی بنیاد پر بڑے بڑے فیصلے کر لینا ہماری عادت بن گیا ہے۔ شوریٰ کی پالیسی کچھ ہوتی ہے، نیچے حالات کے دباؤ کے تحت فیصلہ اس کے خلاف کر لیا جاتا ہے اور ایسا مسلسل ہو رہا ہے، مگر اس پر کبھی کوئی مناسب چیک نظر نہیں آتا۔ غالباً شوریٰ کی اہم امور میں پالیسی اور سوچ نیچے منتقل ہی نہیں ہو پاتی اور ذہن کلیئر نہیں ہوتے، لہٰذا اپنی مرضی سے فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ سب ایسی خرابیاں ہیں کہ جو ایک عرصے سے ہماری اجتماعیت میں موجود ہیں اور اب تو باقاعدہ مزاج کا حصہ بن گئی ہیں۔ پہلے توجہات دلا دی جاتی تھیں مگر اب ایسا کوئی رجحان نہیں ہے۔ سب خرابیاں مصلحتاً خاموش رہ کر برداشت کی جا رہی ہیں، معاشرہ کی خرابیوں پر ان کی ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے کہ معاشرہ خراب ہو گیا ہے تو ہم پر بھی کچھ اثرات تو پڑیں گے! مگر تجدید و احیائے دین کا کام تو ہمیشہ خراب معاشرے میں شروع ہوتا ہے اور جو سعید روحیں اسے سرانجام دیتی ہیں وہ معاشرے کی خرابیوں پر کڑھتے کڑھتے ردعمل کے طور پر دین پر سخت ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کی تنقید انہیں مانجھ دیتی ہے، خود بخود اصلاح کا عمل شروع ہوتا ہے۔ مگر آج تو صورتحال

بدل چکی ہے۔ لوگ رکن بن جاتے ہیں مگر زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آتا' انفرادی معاملات بھی شدید متاثر ہیں مگر رکن ہیں۔ معاشرے پر ذمہ داری ڈالنے کی بجائے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہئے' اپنے ماحول اور نظام کو بہتر بنانا چاہئے' اپنی ترجیحات طے کرنی چاہئیں۔

اس وقت ارکان کی صورتحال یہ ہے کہ ان میں مطالعہ کا رجحان بہت کم ہے اور عظیم نظریہ کا شعور نہیں ہے۔ سنجیدگی کا فقدان ہے۔ لطیفے' پھبتیاں' سیاسی گفتگو اور غیر تحریکی گفتگو کے عادی ہو چکے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک رفیق اور امیدوار کی تربیت تو ایک تسلسل سے جاری رہتی ہے مگر رکن بن کر مزید تربیت ملنے کے بجائے رکن اپنی پہلی تربیت بھی کھونا شروع کر دیتا ہے۔ اب اس کا کام صرف پروگرام منعقد کرنا' رپورٹیں پیش کرنا اور پلاننگ کرنا رہ جاتا ہے جبکہ اسے اپنے مطالعہ اور تربیت کا کوئی دھیان نہیں رہتا۔ یہ درحقیقت ہمارے نظامِ تربیت کی خامی ہے کہ رکن کی مزید تربیت کا اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اور وہ خود بھی اپنی تربیت سے غافل رہتا ہے۔ چنانچہ امیدوار رہتے ہوئے ۱۵ روزہ رپورٹیں ارسال کرنے اور اجتماع امیدواران کے باعث فرد پر چیک رہتا ہے مگر رکن بنتے ہی وہ "تربیت یافتہ" قرار دے دیا جاتا ہے اور اس پر چیک ختم ہو جاتا ہے۔ پھر رکن کی نمازیں کمزور پڑتی ہیں۔ پہلے پانچوں نمازیں جماعت کے ساتھ پڑھنے کی کوشش ہوتی تھی مگر اب انفرادی نمازوں کی بہتات ہونے لگتی ہے۔ پہلے مطالعہ قرآن' حدیث اور لٹریچر میں باقاعدگی ہوتی تھی مگر اب یہ معمولات قصہ پارینہ بن جاتے ہیں۔ بالخصوص روابط اور رفقاء سازی تو ارکان کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ کام تو رفقاء اور امیدواران کے ذمہ لگا ہوا ہے۔ ارکان جو اب ۲' ۴ سال جمعیت میں گزارنے کے بعد اس کو کچھ سمجھ جاتے ہیں تو ان کا عام طلبہ سے رابطہ کٹ جاتا ہے اور ان کے معمولات ہی بدل جاتے ہیں۔ اکثر ارکان دعوت کے کام میں شدید سست ہیں اور بس اپنی مرضی کے کاموں میں ہی شمولیت اختیار کرتے ہیں جو عام طور پر Tempo اور Attraction والے ہوتے ہیں۔ مزاج سیاسی ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہونا تو یہ چاہئے کہ عبادات میں ذوق و شوق' معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب

انداز میں بڑھے، مگر ہوتا یہ ہے کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی پیش نظر ہوتی ہے، جوش و خروش بھی ہوتا ہے، لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں ہوتی ہے اور نوافل تو سرے سے خارج از بحث ہیں۔ دین کی حمایت کا جذبہ تو بہت ترقی کرتا ہے مگر تزکیہ نفس اور اتباع سنتؐ کی جھلک زندگیوں میں موجود نہیں۔ اپنی اصلاح کے بجائے معاشرے کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہے۔ خود تو قرآن سمجھنے کی جانب توجہ نہیں مگر دوسروں کو قرآن کی دعوت دینے میں بڑے مستعد ہیں۔ بلکہ ارکان کی بہت بڑی تعداد ناظرہ قرآن پڑھنا نہیں جانتی۔ اس سے آپ ارکان کے معیار کا اندازہ کر لیجئے۔ جو رُکن قرآن پاک پڑھنا نہیں جانتا وہ اس پر خود کیا عمل کرے گا! اور دوسروں کو کس منہ سے دعوت دے گا! اور اس کی بات میں کیا اثر ہو گا۔ یہ افسوسناک صورتحال ہے اور اس کا بغور جائزہ لے کر سدِباب کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اسلام کے نام سے بڑی محبت ہو چکی ہے اور معاشرے میں اس کے نفاذ کی ضرورت بیان کرتے ہم نہیں تھکتے مگر اپنے اوپر اسلام کے نفاذ سے ہم بے پرواہیں۔ اسی طرح ہمارے ارکان اور کارکنان کو "جہاد" کے لفظ سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے اور ہم دوسری دینی جماعتوں کو طعنے دیتے ہیں اور اپنی زبان سے خود ہی اپنے جہاد کی تعریفیں بھی لوگوں کے سامنے کرتے ہیں مگر افسوس کہ بھاگ بھاگ کر افغانستان اور کشمیر جانے والے ہمارے ساتھیوں کو اپنی اخلاقی تربیت کی کوئی فکر نہیں۔ وہ عظیم جہاد کرنے کے لئے تو نکل کھڑے ہوتے ہیں مگر فلسفہ جہاد سے بالکل بے خبر اور نماز اور قرآن سے تعلق برائے نام ہوتا ہے۔ ہمارے تمام لڑاکا ساتھی 'Terror' کہلانے والے، نظم کی عدم اطاعت کرنے والے اور سیاسی مزاج رکھنے والے بڑی تیزی سے جہادی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ وہ نظم سے پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ نظم اگر کسی مصلحت کے تحت روکے تو اسے "اینٹی جہاد" کہتے ہیں۔ وہ ساتھی جو دعوتی و تنظیمی کام نہیں کر سکتے یا اس میں دلچسپی نہیں لیتے اور غیر سنجیدہ ہوتے ہیں وہ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے افغانستان بھاگ جاتے ہیں۔ جس ساتھی کی رفاقت یا رکنیت معطل ہو وہ افغانستان چلا جاتا ہے۔ پتا نہیں اس مزاج کے افراد وہاں کس قسم کا جہاد کر رہے ہیں کہ یہ جہاد ان کے مزاج میں ذرہ برابر تبدیلی پیدا نہیں کر رہا۔ ہو یہ رہا ہے کہ بڑی تعداد میں ساتھی وہاں سے اسلحہ کی

ٹریننگ لیتے جا رہے ہیں اور واپس آ کر کالجوں میں لڑائیوں کے انتظار میں رہتے ہیں تا کہ وہ اپنے جوہر دکھا سکیں۔ ان کے جنگجو مزاج کو قابو کرنا نظم کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ خدارا ان معاملات کو چیک کریں وگرنہ یہ جہاد کہیں ہمارے لئے فساد نہ بن جائے کیونکہ صبر ہمارے ساتھیوں میں پہلے ہی کم ہو گیا ہے' انہیں تشدد کی زبان میں بات کرنے کی عادت پڑتی جا رہی ہے۔ کیمپوں میں بھی خاطر خواہ نظریاتی و اخلاقی تربیت کا انتظام نہیں ہے اور زیادہ زور اسلحہ کی تربیت پر ہی صرف کیا جاتا ہے۔ بڑی تعداد میں عام افراد بھی ہمارے فورم سے وہاں جا رہے ہیں اور واپس آ کر سپاہ صحابہ' اہلحدیث اور اے ٹی آئی میں گم ہو جاتے ہیں۔ جو ساتھی افغانستان سے ہو آتا ہے وہ نظم کو بتائے بغیر عام لوگوں کو خود ہی وہاں بھیج دیتا ہے یا خود چھوڑ آتا ہے۔ اس معاملے کو چیک کرنے کی ضرورت ہے اور فی الوقت کیمپوں میں شرکت کے باوجود ہمارے ساتھیوں کی تربیت نہیں ہو پا رہی ہے۔

بدقسمتی سے اس وقت تحریک کے افراد خواہ جماعت کے ارکان ہوں یا جمعیت کے ارکان' اور دیگر وابستگان کی ایک بہت بڑی تعداد تحریک کے بارے میں سوچنے سمجھنے کی کوششیں ہی نہیں کر رہی کہ ہم اس وقت کس صورتحال سے دوچار ہیں اور ہمیں کیا لائحہ عمل اپنانا چاہئے۔ جماعت کے ارکان تو اپنے کاروباروں میں الجھے ہوئے ہیں اور جمعیت کے ارکان سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے یا سوچتے ہیں تو صرف "Tempo" کے بارے میں۔ مولانا صدر الدین اصلاحی اپنے کتابچہ "اسلامی تحریکوں کی ناکامی کے اصل اسباب" میں رقم طراز ہیں :

> "اسلام نے جو دین فطرت ہے' اپنی سوجھ بوجھ سے کام لینے کو انسان کے بنیادی حقوق ہی میں نہیں بلکہ اس کے بنیادی فرائض میں بھی شمار کیا ہے۔ وہ اس شخص کو جو عقل و فہم سے کام نہ لے "کَالْاَنْعَام" (جانوروں کے مشابہ) کہتا ہے اور اس شخص کو جو جانتے بوجھتے بھی حق بات ظاہر کرنے سے کنی کاٹ جائے "شَیطان اَخْرَس" (گونگا شیطان) قرار دیتا ہے"۔

بڑی تعداد میں ہمارے ساتھی معاملات کی خرابیوں کو دیکھ رہے ہیں مگر افسوس کہ وہ گونگے شیطان کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ نظم کو توجہ نہیں دلاتے' بس دل میں افسوس کرتے

رہتے ہیں اور باقی لوگ تو سوچتے ہی نہیں۔ یہ روش افسوس ناک ہے۔

اس وقت تحریک اسلامی جس پالیسی پر عمل پیرا ہے اسے اس کے مزاج اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ اپنی سابقہ غلطیوں کو تسلیم کر کے اب تحریک کو صحیح رخ پر ڈالا جائے' اس کے اندر اصلاح کی جائے اور پھر صحیح انقلابی و اصولی روش اختیار کر لی جائے' عوام کو اپنی جانب متوجہ کرنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے غیر اصولی نعرے دیئے جا رہے ہیں۔ اگر لوگ تحریک میں جذب نہیں ہو رہے ہیں تو اس میں کچھ ہماری اپنی غلطیاں اور کچھ لوگوں کی خامیاں اور خود غرضی ہے۔ ہمیں اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے باقی معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہئے۔ لوگ ہمارے ساتھ ہماری اصول پسندی کی وجہ سے اگر نہیں لگتے اور مفاد پرستی اور دنیاداری و منافقت ان پر غالب ہے تو اس رویئے کے سبب اپنی پالیسی بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو لوگوں اور خدا کا معاملہ ہے' وہ خود انہیں سزا دے گا۔ مگر ہم لوگوں کو بے جا رعایتیں اور ڈھیل دے کر اپنی اجتماعیت میں کیوں لائیں؟ اس طرح کی مداہنت و مصلحت پسندی سے ہم لوگوں کی حمایت حاصل کر بھی لیں تو بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس طرح اسلامی انقلاب نہ آ سکے گا۔ ہمیں پہلے معاشرے میں اسلام کی پیاس پیدا کرنی چاہئے' سارا زور اقتدار کے حصول اور اس کے ذریعے اصلاح پر صرف کرنا اصولی طور پر غلط ہے۔ آج ظلم کے خلاف نعرے بلند کئے جا رہے ہیں' تحریکیں چل رہی ہیں' مسائل حل کرنے کے وعدے و نعرے دیئے جا رہے ہیں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف غریبوں کو اکسا کر طبقاتی کشمکش پیدا کی جا رہی ہے' سوشل کام کرنے کی سکیمیں بن رہی ہیں اور ان سب کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قریب لایا جائے اور انہیں اجتماعیت میں جذب کر کے دین کی خدمت لی جائے۔ مگر جو لوگ مفاد کی خاطر' مسئلے حل کروانے کے لئے اور لبرل پاسبان اور اسلامک فرنٹ کے ذریعے ہمارے ساتھ آئیں گے وہ اسلامی تحریک کے لئے کوئی تعمیری کام نہ کر سکیں گے۔ کسی بھی کٹھن مرحلے پر وہ ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ وہ گانے بھی سنیں گے' بھنگڑے بھی ڈالیں گے' عدم اطاعتِ نظم کا مظاہرہ بھی کریں گے اور تحریک اسلامی کے تشخص کا لحاظ بھی نہیں کریں گے' وہ کارواں کے ساتھ شامل ہو کر کوچ میں انڈین فلمیں بھی دیکھیں گے۔ ایسی تمام سرگرمیوں سے

ہمارے اپنے کارکن بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اس سے مزاج انقلابی نہیں رہتے' مصلحت پسند و لبرل ہو جاتے ہیں۔ اقربا پروری' سفارش اور مادہ پرستی کے رجحانات تحریک میں تیزی سے پھیلتے ہیں اور آج یہ چیزیں ارکان میں نمایاں ہیں۔ سید مودودیؒ نے "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" میں نبی ﷺ کے دور کا نمایاں نقشہ کھینچ کر ثابت کیا ہے کہ اسلامی تحریک ایسے ہنگامی کام کی بنیاد پر دعوتی کام نہیں کرتی۔

> "رسولؐ جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی' تمدنی' معاشی' سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا' طبقاتی امتیازات بھی تھے' ناجائز معاشی انتفاع بھی ہو رہا تھا' اخلاقی زمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپؐ کے اپنے ملک میں ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت' اخلاقی پستی' افلاس' طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ بحرین سے یمن تک عرب کے تمام ساحلی علاقے عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سود خواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مشرقی ساحل کے عین مقابل افریقہ میں حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہبوں اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ کی' بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو"۔ (صفحہ : ۲۴'۲۵)

گویا نبی ﷺ نے سب مسائل سے قطع نظر اصولی دعوت پیش کی اور بڑی سست رفتاری سے (یعنی تدریجاً) آگے بڑھتے رہے۔ ابتدائی ۶ سال میں صرف ۴۰ افراد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسلامی تحریک مسائل حل نہیں کرتی' بلکہ نبی

ﷺ نے آگے چل کر سب مسئلے حل کئے' مگر اس وقت جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی یعنی اقتدار ہاتھ میں آگیا۔ آج ہم وقت سے پہلے غیر انقلابی طریقے استعمال کر رہے ہیں' جو ہمارے کارکن ہی نہیں بلکہ ارکان پر منفی اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ مزاج بگڑ رہے ہیں اور نظریئے اور تزکیۂ نفس سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی کاموں میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ اسلام کا نعرہ تو بہت ہے مگر اس پر عمل کم ہو رہا ہے۔ اس وقت جس انداز میں تحریک کام کر رہی ہے' اس کے دو ہی نتائج نکل سکتے ہیں' یا تو ہم عوام میں اپنا تشخص اور قدر کھو بیٹھیں گے جیسا کہ اس بار الیکشن میں ہوا ہے کہ مادی اعتبار سے تو ناکام ہوئے ہی ہیں مگر اخلاقی فتح بھی ہمیں حاصل نہ ہو سکی اور غلط قسم کے امیدواروں اور کارکنوں کے باعث ہمارا اسلامی اور اصولی تشخص شدید مجروح ہوا ہے' جبکہ ۷۰ء میں کم از کم اخلاقی فتح ہمیں حاصل ہو گئی تھی۔ گویا خالص اسلامی معیار کو ترک کرنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا و آخرت میں بھی ناکام کر سکتے ہیں۔ یوں ہمارا حال دنیاوی اعتبار سے سید احمد شہیدؒ کی تحریک جیسا ہو سکتا ہے کہ جواب گوشہ گمنامی میں جا چکی ہے مگر موجود ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ خوب عوامی رنگ' ڈھنگ اور مصلحت پسندی کے باعث ہم عوامی حمایت حاصل کر لیں اور کچھ تنظیمی اور کچھ آزاد امیدواروں کو کامیاب کرا کے اقتدار میں آ جائیں مگر اس صورت میں طے شدہ بات ہے کہ کچھ صالح لوگ تو حکومت میں آ جائیں گے مگر حقیقی اسلامی انقلاب نہ آ سکے گا' محض سطحی تبدیلیاں ہی لائی جا سکیں گی' کیونکہ اگر خالص اسلام نافذ کرنے کی کوشش کی جائے گی تو عوام باغی ہو جائیں گے اور وہ ہم سے مفاد طلب کریں گے۔ پھر کچھ اسلام تو نافذ ہو جائے گا اور باقی اسلام مصلحت پسندی کی نذر ہو جائے گا۔ اور اسلامی تحریک وہی روش اختیار کرے گی جو مسلم لیگ قیام پاکستان سے اب تک اختیار کرتی چلی آ رہی ہے۔ سیاسی' معاشی اور معاشرتی ڈھانچے میں کلی تبدیلیاں نہ آ سکیں گی بلکہ جزوی تبدیلیاں ہی رونما ہو سکیں گی۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے اثرات کم ہو جائیں گے مگر برادری ازم بدستور موجود رہے گا۔ کچھ مڈل کلاس آگے آ جائے گی' اسلام پر بھی کچھ عمل کیا جائے گا' مگر اقربا پروری' سفارش بدستور چلیں گی۔ پروٹوکول کے اخراجات برقرار رہیں گے۔ معاشرے میں کچھ فضا بدلے گی۔ نمازیوں اور پردے میں

اضافہ ہو گا' مگر تمام جاہلانہ رسومات ختم نہ ہو سکیں گی۔ شادی بیاہ کی رسمیں اور ان پر بے پناہ فضول خرچی سے آج تحریکی افراد نہیں بچ پا رہے تو بعد میں یہ کیسے ختم ہوں گے! Standards کم نہ ہو سکیں گے۔ کوٹھی' کار' فرنیچر' لباس کی جدت طرازیاں برقرار رہیں گی۔ ختم' قل' چالیسویں بھی چلتے رہیں گے۔ موجودہ انتخابی طریقہ بھی چلتا رہے گا کہ اسی کے ذریعے تو ہم خود اوپر آئیں گے۔ معاشیات کو درست کرنا بھی بڑا مسئلہ ہو گا۔ کاروباری حضرات آڑے آئیں گے اور ہم ان سے ووٹ لے چکے ہوں گے لہٰذا کچھ ان کی باتیں ماننا پڑیں گی۔ گویا ہم قوت سے اسلام نافذ نہ کر سکیں گے اور کافر تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں ناکام رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیاداری کے زبردست اثرات آج ہمارے ارکان تک میں موجود ہیں' اقتدار میں آنے کے بعد تو یہ اثرات مزید بڑھ جائیں گے۔ یہ نشہ تو بڑے بڑے متقیوں کو خراب کر سکتا ہے!

موجودہ کیفیت کے مطابق یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ ہم انتہائی مصلحت پرست اور عوام پرست ہو چکے ہیں۔ لوگوں کو رعایتیں دینے کے عادی ہو گئے ہیں اور یوں خرابیاں برداشت کرنا ہمارے مزاج کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ کہاں تو سگریٹ نوشی ہماری جماعت میں ایسے ممنوع تھی جیسے حرام ہو' مگر اب تو بڑی تعداد میں ایسے لوگ ہماری اجتماعیت میں موجود ہیں جو کھلے عام یہ شوق کرتے ہیں' "کارکن" اور "ارکان" کہلاتے ہیں۔ اور یہ ہماری طبائع پر گراں بھی نہیں گزرتا۔ اسی طرح ہمارے کارکن اب تاش بھی کھیل لیتے ہیں' جبکہ پہلے ہم اس فعل کو برا سمجھتے تھے' اب برداشت کر لیتے ہیں۔ پھر ہمارے افراد تعلیمی اداروں میں مخلوط محفلوں میں بھی بیٹھتے ہیں مگر ہم ان کو روک نہیں پاتے' اپنے سے دور نہیں کر پاتے کیونکہ ہمیں تو لڑائیوں میں ان کی ضرورت ہوتی ہے' ہمیں تو ان سے ووٹ لینا ہوتا ہے۔ اب تو ہم مخلوط پروگرام خود بھی منعقد کرانے لگے ہیں' گویا آہستہ آہستہ ایسی خرابیوں کو انگیز کرنے کی ہمیں عادت پڑتی جا رہی ہے جو کل کو مزید بڑھ جائے گی۔ ایک انقلابی جماعت حالات سے کبھی Compromise نہیں کیا کرتی۔ اس کے اپنے اصول اور ترجیحات ہوتی ہیں۔ ان میں لچک اختیار کرنا اس کی موت کے مترادف ہوتا ہے۔ انقلابی تحریک کبھی مصلحت پسند اور عوام پرست نہیں ہوتی۔ وہ حق بات ڈنکے کی

چوٹ کہتی ہے 'لوگ اس کی طرف آنا چاہیں تو آئیں وگرنہ دور ہی رہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ لوگوں کو ضرور جذب کرنے کے لئے غیر انقلابی سرگرمیاں رکھی جائیں' Relaxation دی جائے' ٹیمپو اور تفریح کا عنصر شامل کیا جائے تا کہ وہ Attract ہو سکیں۔ پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ بڑا جلسہ نہ ہوا تو کارکنان Inactive رہیں گے۔ گویا سیاسی مزاج کو خوش کرنے کے لئے ٹیمپو ضروری ہے۔ اس قسم کے پروگرام اور ایسی سوسائٹیاں انقلابی کام کے لئے قطعاً فائدہ مند نہیں ہوتی ہیں بلکہ الٹا انقلابی کارکنان کا مزاج خراب کر دیتی ہیں' اصل کاموں سے ان کی توجہ ہٹا دیتی ہیں اور انہیں مصلحت پسند بنا دیتی ہیں۔ ہم انہیں رابطے کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو آخر رابطہ ان کے ذریعے ہی کیوں؟ ہم انفرادی رابطہ کیوں نہ کریں' خود لوگوں سے کیوں نہ ملیں' discuss کیوں نہ کریں اور اس طرح دعوت دیں' مگر یہ کام مشکل ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ دوسری سرگرمیاں اپنالی گئی ہیں' ان میں دلچسپی اور رنگینی ہے' ان کا تذکرہ اخبارات میں نمایاں آتا ہے' ٹی وی پر بھی ایسی سرگرمیاں کور کی جاتی ہیں' ان میں بڑے بڑے عہدے دار' سپیکر اور چیئرمین سینٹ آتے ہیں۔ اس سے جمعیت کا نام ابھرتا ہے' نفس کو مزا آتا ہے اور کارکن Active ہوتے ہیں۔ اسلامی انقلابی کارکن وہ ہوتے ہیں جو اپنے نظریئے کو فرض عین سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ اسے صرف پسند نہیں کرتے بلکہ اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا تے لیتے ہیں۔ وہ بس اپنے نظریئے کے ہو رہتے ہیں۔ ان میں زبردست قوت عمل ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے اسے غالب کرنے کے لئے وہ بے چین رہتے ہیں۔ جان' مال اور وقت اس راہ میں لگاتے ہیں۔ اس نظریہ کو ترجیح اول بنا لیتے ہیں اور پھر ذرہ برابر مفاد ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ اور وہ اصول پسند ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ایک اسلامی سیاسی جماعت کے کارکن مصلحت پسند اور عوام پرست ہوتے ہیں' وہ اس کام کو فرض عین نہیں بلکہ ایک "اچھا کام" سمجھ کر کرتے ہیں' اسی لئے یہ ان کی ترجیح اول نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ جان مال اور وقت لگانے میں کنجوسی کرتے ہیں' سست ہوتے ہیں' قوت عمل کا فقدان ہوتا ہے' ان میں باہمی محبت اور ایثار کی کمی ہوتی ہے اور ان کے مفادات بھی اس اجتماعیت سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں دنیاداری بھی ہوتی ہے اور ہم تو گویا انقلابی کام کب سے چھوڑ بیٹھے ہیں

اور سیاسی مصلحتوں نے ہمیں غیر ارادی طور پر اپنی ترجیحات بدلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انقلابی جذبے اب صرف چند لوگوں میں ہیں، وہ بھی وہ ہیں جنہیں بھاری ذمہ داریوں نے جکڑ رکھا ہے، انہیں کے سر پر کام چل رہا ہے وگرنہ نیچے تو خدا ہی حافظ ہے، مگر کب تک؟ آخر اوپر کے لوگوں کو جگہ تو چھوڑنی ہے پھر نیچے والوں کے ہاتھ میں قیادت آئے گی تو یہ خرابیاں دوچند ہو جائیں گی۔ اس ضمن میں قرآن کی وہ آیات ہماری بھرپور رہنمائی کرتی ہیں جن میں نبی ﷺ کو ایسا رویہ اپنانے سے منع فرمایا گیا ہے۔

"(اے نبیؐ) تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں"۔ (القلم : ۸'۹)

واقعی قریش تو کہا کرتے تھے کہ محمد (ﷺ) تم ہمیں صرف لات اور عزیٰ کو پوجنے کی اجازت دے دو، کچھ رعایات دے دو تو ہم تمہاری مخالفت بند کر دیں گے، مگر نبیؐ نے ایسا سمجھوتہ کبھی نہ کیا۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۷۳ تا ۷۵ ملاحظہ فرمائیں :

"اے نبیؐ! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے، لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے"۔

ان آیات کی روشنی میں ہمیں اپنے رویوں کا جائزہ لینا چاہئے کیونکہ ہم نے بالخصوص پنجاب کے ماحول کو سامنے رکھ کر بہت ساری مصلحتوں کو اپنا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے بھی ہے کہ ہم صبر اور سکون کے ساتھ انقلاب لانے کی جدوجہد نہیں کر پا رہے، ہمیں انقلاب لانے کی بہت جلدی ہے، ہم بہرصورت انقلاب لانا چاہتے ہیں، چاہے اس کے لئے کچھ اصولوں کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ایک بار جلدی جلدی اقتدار میں آ جائیں تو پھر وسائل کو کنٹرول کر کے اصلاح کا کام کر سکیں گے مگر جس عجلت پسندی اور عوام پرستی کے ذریعے ہم اقتدار میں آئیں گے اس میں اصلاحات کرتے ہوئے ہمیں اپنے

عوام کے مزاج کو سامنے رکھنا پڑے گا اور یہ مزاج زیادہ اصلاح برداشت نہ کرے گا بلکہ سطحی اقدامات چاہے گا۔ اقرباپروری اور سفارش کے تو ہم اب بھی قائل ہیں' جب اقتدار آئے گا تو یہ خرابیاں عوامی دباؤ کے باعث مزید بڑھ جائیں گی۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ عجلت پسند واقع ہوا ہے۔

"انسان جلد باز مخلوق ہے"۔ (الانبیاء : ۳۷)

"انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے"۔ (بنی اسرائیل : ۱۱)

بہرحال ہمارا کام یہ ہے کہ خامی محسوس کر کے ہم اصلاح کی کوشش کریں مگر اس کو باقاعدہ مزاج کا حصہ بنالینا یا بن جانے دینا کسی طرح درست نہیں۔

ایک بہت ہی اہم معاملے کا تذکرہ کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ میری مراد نہی عن المنکر کی پالیسی سے ہے۔ یہ وہ غلطی ہے جو ہم گزشتہ بیس سال سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ حالانکہ شوریٰ کی ہمیشہ یہ سوچ رہی ہے کہ ہم لڑائیوں سے گریز کریں گے مگر نہی عن المنکر کے نام پر ہم بے پناہ لڑائیاں لڑ چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاید آج تک شوریٰ کی یہ پالیسی نیچے منتقل نہیں ہو سکی ہے۔ ارکان کو اس کا پتا نہیں ہے' انہیں یہ "فیڈ" نہیں کی گئی۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں ہمیں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ بدقسمتی سے جس مقام پر بھی فیصلہ کیا گیا انتہائی سطحی دلائل کے ساتھ کیا گیا حالانکہ نہی عن المنکر اسلامی تحریک کے لئے ایک بہت بڑا مرحلہ ہوتا ہے۔ نہی عن المنکر یا خروج یا جہاد ہر اسلامی تحریک کے لئے آخری اور فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر یہاں غلطی ہو جائے تو پوری تحریک تباہی سے دوچار ہو سکتی ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ سے اسی آخری مقام پر اجتہادی غلطی ہوئی انہوں نے سرحد میں دعوت کا کام بڑے پیمانے پر نہ کیا اور قبل از وقت جہاد کا آغاز کیا اور اسلامی حکومت قائم کر دی جبکہ عوام ذہنی طور پر ان قوانین کے لئے تیار نہ تھے۔ اسی طرح عصر حاضر میں شام' مصر اور عراق میں اخوان المسلمون کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اخوان نے حکومت یا باطل نظام سے قبل از وقت ٹکر لی' تیاری مکمل نہ تھی اور یوں انہیں بری طرح سے کچل دیا گیا۔ ایوب دور کی سختیوں کے نتیجے میں مولانا مودودیؒ کو یہ رائے دی گئی کہ اب ہمیں جہاد کا آغاز کرنا چاہئے مگر انہوں نے سختی سے تردید کی اور

کہا کہ میں اخوان المسلمون والی غلطی نہیں کرنا چاہتا۔ دراصل یہ خالصتاً اجتہادی فیصلہ ہوتا ہے اور اسے تحریک کا داعی یا اس کے اہل حل وعقد مناسب موقع پر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا اسلم صدیقی صاحب نے بھی بتایا تھا اور امام ابو حنیفہؒ نے کچھ اصول بیان فرمائے ہیں :

۱۔ اس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہئے۔ بغیر اجتہاد کئے ایسا فیصلہ کرنے سے ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔

۲۔ افرادی قوت مناسب تعداد میں فراہم ہو تو پھر ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر افراد کم ہوں تو جہاد کا فیصلہ قتل کرانے کے مترادف ہے۔

۳۔ وسائل بھی فراہم ہونے چاہئیں۔

۳۔ افراد موجود ہوں تو ان کی تربیت کا جائزہ لیا جائے کہ ان کی اپنی اخلاقی صورتحال کیا ہے۔

۴۔ یہ فیصلہ کر کے علی الاعلان کارروائی کی جائے تاکہ رائے عامہ اندھیرے میں نہ رہے اور حق کا ساتھ دے۔

ہماری صورتحال یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اکابرین نے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا نہ اجتہاد کیا اور ہم نے یہ کام تعلیمی اداروں میں شروع کر دیئے جبکہ جمعیت کو لوگ جماعت ہی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اس کا براہ راست اثر جماعت پر ہوا ہے۔ پھر ہمارے پاس افرادی قوت اور وسائل کی بھی کمی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم نے علی الاعلان یہ کام نہیں کیا بلکہ مختلف تعلیمی اداروں کی حدود میں یہ کارروائی کی جس کا عوام کو کچھ پتا نہیں کہ ہم نے کیا کیا اور کیوں کیا۔ چنانچہ انہیں تو یہی پتا ہے کہ کالجوں میں اسلحہ چلتا ہے اور جماعت والے بڑی دہشت گردی کرتے ہیں اور منصورہ اور پنجاب یونیورسٹی اس کے گڑھ ہیں۔ گویا ایک نیک کام کر کے بھی رائے عامہ ہمارے حق میں نہیں آسکی۔ یہ ہماری اپنی غلط حکمت عملی کا نتیجہ ہے اور اسی خوف سے آج ٹیلنٹ جمعیت کا رخ نہیں کر رہا ہے اور دیندار طلبہ تبلیغی جماعت اور دیگر مذہبی تنظیموں کا رخ کر رہے ہیں۔ یوں ہمیں بحران کا سامنا ہے۔

مروجہ سیاست بالخصوص انتخابی سیاست کا مزاج ایسا خراب ہے کہ آج تک ہم اس

میں Adjust نہیں ہو سکے، اب بھی Misfit ہیں۔ جہاں ملک کے ۹۰ فیصد عوام ان پڑھ ہوں، جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام بدترین شکل میں رائج ہو، برادری ازم اور قوم پرستی کے فتنے موجود ہوں، بے پناہ وسائل درکار ہوں اور جھوٹ، مکر و فریب، الزام تراشی اور بے ایمانی مروجہ سیاست کے لازمی اجزاء ہوں وہاں اسلامی تحریک آخر کیسے Adjust ہو سکتی ہے۔ ووٹ لینے کے لئے تو عوام کو خوش کرنا پڑتا ہے، جیسے عوام چاہیں ویسی پالیسی لانا پڑتی ہے۔ پھر اسلامی تحریک اپنے اصولوں کو کیونکر قربان کر سکتی ہے، مگر مسلسل اس عمل میں شریک رہنے کے نتیجے میں ہم اصولوں پر قائم نہ رہ سکے بلکہ مصلحت پسند اور عوام پرست ہوتے چلے گئے اور غیر تحریکی مزاج ہمارے اندر سرایت کرتا چلا گیا۔ نتیجتاً ہم اپنے معیار کو کھو بیٹھے ہیں۔ آج بھی اگر کالجوں میں انتخابات ہوں تو ہمیں محض جیتنے کے لئے منفی مزاج کے لوگوں، برادریوں، گروپوں سے سمجھوتے اور اتحاد کرنا پڑیں گے، بھرپور انداز میں اس ہنگامے میں شریک ہونا پڑے گا اور پھر جیت گئے تو لوگوں کے کاموں اور مسائل میں اس قدر الجھیں گے کہ اپنا اصل کام چھوڑ بیٹھیں گے۔ یہ سوچنا کہ کالج کے وسائل اور اقتدار ہاتھ میں آنے سے دعوت پھیلانے میں آسانی ہوگی اور زیادہ لوگ متوجہ ہونگے، میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ لوگ ایسی صورت میں ہماری طرف رجوع ضرور کریں گے مگر مفادات کی خاطر، تعلقات بنانے کی خاطر۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ اقتدار کے ذریعے دعوت کا کام اور اصلاح نہیں ہو سکی ہے، یعنی اسلامی تحریک کو نیچے سے اصلاح کر کے اوپر جانا چاہئے نہ کہ اوپر سے اصلاح کی کوششیں کرنے کا ذہن بنایا جائے۔ اس ضمن میں عمر بن عبدالعزیزؒ کی مثال موجود ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود وہ اقتدار کے دور میں اصلاح نہ کر سکے۔ محمد تغلقؒ اور اورنگ زیبؒ بھی بڑا عرصہ اقتدار میں رہے، بڑے نیک اور پارسا تھے بالخصوص اورنگزیبؒ، مگر اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر اگر ہم کالج کی اس روایتی سیاست سے نکلنے کا اعلان کر دیں تو ہمارا مخالف تنظیموں سے جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ ہم ان کے اقتدار میں ہی تو رکاوٹ ہیں، تبھی تو وہ ہمیں خطرہ سمجھتے ہیں۔ تب جھگڑا صرف اس وقت ہوگا جب ہم انکی برائی کی محفلوں کو سختی سے روکیں گے اور ایسا فیصلہ ہم مناسب وقت پر کریں گے جبکہ روایتی

لڑائیاں اور سیاست کے خاتمہ کے باعث منفی مزاج ہمارے قریب نہ آئے گا اور ایک بڑی تعداد جو اس خوف سے ہم سے دور رہتی ہے' ان شاء اللہ وہ جذب ہو گی اور ہم اپنا اصل دعوتی و فکری کام ٹھوس بنیادوں پر اور بڑے پیمانے پر کرنے کے قابل ہوں گے۔ ہماری حیثیت تو یوں بھی ایک نرسری کی ہے۔ ہمیں تو تحریک اسلامی کو ٹیلنٹ فراہم کرنا ہے' دانشور' ادیب اور قیادت دینی ہے تو یہ کام تو پر سکون اور پر امن ماحول میں ہی ہو سکتا ہے۔ بقول نعیم صدیقی صاحب اگر جمعیت ہر سال ۸' ۱۰ افراد بھی ایسے تحریک کو دے دے کہ جن کو تحریک وسیع مطالعہ اور کتب کی تصنیف و تالیف کے لئے تیار کر سکے تو یہ بہت بڑا کام ہو گا اور تسلسل سے ایسے افراد ملتے رہیں تو ہم بہت بڑا کام علمی و فکری سطح پر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ہم نے انتخابات کو "ناگزیر برائی" کہہ کر بھی اسی لئے اپنایا تھا کہ اس کے ذریعے دعوت کا فروغ ہو' عوام سے رابطہ ہو اور جمہوری طریقے سے کامیابی ہو' پر امن ماحول ہو' مگر یہ نہ کل ہمارا مقصد تھے نہ آج ہیں بلکہ صرف مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اگر چالیس سال تک بھی ان کے ذریعے مقصد حاصل نہیں ہو سکا تو پھر ان میں شامل ہونا لازم تو نہیں۔ ان کے منفی تقاضوں سے اسلامی تحریک ہم آہنگ نہیں ہو سکتی اور اگر وہ ہم آہنگ ہونا چاہے گی تو اسے مصلحت پسند اور عوام پرست بننا پڑے گا اور یہی ہم نے کیا ہے۔

مزید برآں ہمارے ہاں باطنی تربیت کا سامان نہیں ہے' روحانیت کا فقدان ہے۔ نماز تربیت کا ذریعہ نہیں بن سکی' اگر نہ پانچ وقت کی نماز خشوع و خضوع سے پڑھی جائے تو یہی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ نفلی عبادات کی طرف تو ہمارا رجحان بالکل نہ ہونے کے برابر ہے' اس لئے مادہ پرستی اور دنیاداری ہمارے اندر سے مکمل طور پر نہیں نکل سکی ہے۔ سنجیدگی بھی پیدا نہیں ہو سکی۔ حالانکہ اسلامی تحریک کو جو کٹھن اور جاں گسل حالات درپیش ہوتے ہیں ان میں ثابت قدمی کے لئے تعلق باللہ ہی سب سے بڑا سہارا ہے مگر اس کا فقدان ہے۔ اس کی کمی تہجد کی نماز اور شب بیداریوں کے ذریعے پوری ہو سکتی ہے مگر انہیں نفل کہہ کر اور یہ کہہ کر یہ فرض نہیں ہیں جو چاہے کرلے' لازمی نہیں ہے' ہم اسے اپنی اجتماعیت میں رائج نہیں کر سکے' اس کی ترغیب نہیں دے سکے۔ لہٰذا اس کی ترغیب کا مناسب بندوبست کرنا چاہئے۔ کم از کم ارکان اور امیدواران کو اجتماعات میں مستقل

ترغیب دینی چاہئے اور پھر جائزہ بھی لینا چاہئے' جس کا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ صرف اتنا ہی پوچھا جائے کہ آپ نے تہجد پڑھنا شروع کر دی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو ترغیب دے دی جائے۔ کوئی سوال اور احتساب نہ کیا جائے۔ میرے خیال میں اس حد تک ترغیب کا انتظام بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تربیت گاہوں میں اہتمام کرنا چاہئے کہ انہیں تہجد کی نماز باقاعدہ پڑھائی جائے کیونکہ ترغیب دینے کے لئے ۲' ۴ دن باقاعدہ تہجد پڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

بزم پیغام کے حوالے سے بھی چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ایک تلخ حقیقت کے طور پر کر لینا چاہئے کہ آج جمعیت کو طلباء میں کوئی پذیرائی نہیں مل رہی' لوگ اس میں جذب نہیں ہو رہے' بالخصوص ٹیلنٹ تو بہت دور جا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم نے باقاعدہ طور پر سکولوں میں نئے انداز سے کام کا آغاز کیا ہے تا کہ چھوٹی عمر کے طلباء تک نیکی کی دعوت پہنچ جائے اور ٹیلنٹ بھی تلاش کیا جا سکے۔ یقیناً یہ ایک پیچیدہ کام ہے اور اسلامی تاریخ میں ہمیں بچوں میں باقاعدہ طور پر اسلامی تحریک کے کام کا کوئی نقشہ نہیں ملتا۔ یہ بات اہم ہے کہ جماعت' جمعیت اور بزم پیغام کے کام کرنے کے انداز الگ الگ ہیں۔ تینوں میں پروگراموں کی نوعیت مختلف ہے' یوں ایک ہی تحریک کے مختلف شعبوں یا ونگز میں کام کر کے مختلف مزاج کے رکن تیار ہو رہے ہیں۔ یہ بات نمایاں ہے کہ جماعت کے وہ اکابرین جنہوں نے شروع سے جماعت میں تربیت پائی ہے وہ بحیثیت مجموعی سوچ اور مزاج کے اعتبار سے ان اکابرین سے مختلف ہیں جو جمعیت میں کام کر چکے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تحریک میں ایک جیسا مزاج' سوچ اور طریقہ کار پروان چڑھنا چاہئے وگرنہ کشاکش کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ طبیعتوں کا فرق تو ہو سکتا ہے مگر طریقہ کار پر یکسوئی ضروری ہے۔ یہی مسئلہ جمعیت اور بزم پیغام میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ بزم پیغام میں ہم نے بالکل نیا اور لبرل انداز اپنایا ہے۔ ہمارا تمام تر زور اور سوچیں اس بات پر صرف ہو رہی ہیں کہ ہم بچوں کے لئے Attraction پیدا کریں۔ کھیلیں' لطائف' کارڈ' کیسٹیں' سکاؤٹنگ اور دیگر رنگین سرگرمیاں ہم انہیں دے رہے ہیں۔ گویا ۵۰ فیصد نیکی کی دعوت

اور انداز میں ہو گی اور وہ جمعیت کے خشک پروگراموں میں بالکل دلچسپی نہیں لیں گے اور رنگینی' دلچسپی اور ٹیمپو کے خواہش مند ہوں گے۔ یہاں کام کرنے والے ارکان' امیدواران اور رفقاء کا مزاج بھی ماحول کی مناسبت سے بدل جائے گا۔ پہلے ہی جمعیت کے ارکان کا مزاج غیر تحریکی اور غیر انقلابی ہے' اب مزید خراب ہو جائے گا۔ پھر ایک اور انتہائی اہم اور نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ بزم پیغام کی مشاورتی کونسل کے ممبران کا مطالعہ بڑا محدود ہے اور وہ نظریئے کا گہرا شعور نہیں رکھتے جبکہ انہیں بچوں کی نظریاتی و فکری تربیت کا ایک انتہائی نازک اور پیچیدہ کام سونپ دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ بچوں کی تربیت کا صحیح خاکہ بنانے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ اہم نوعیت کے فیصلے کونسل کے ارکان خود ہی کر رہے ہیں۔ مثلاً شاہین کارڈ پر تصویر چسپاں کرنے کا مسئلہ آیا تو کونسل نے یہ "اجتہاد" خود ہی کر لیا۔ پھر کیسٹ کی ریکارڈنگ کا مرحلہ آیا تو اس میں میوزک کا استعمال لے بنانے کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ حالانکہ موسیقی کا استعمال صریحاً ناجائز ہے۔ مگر دلیل یہ تھی کہ کیسٹ میں موسیقی نہ آئے گی صرف سٹوڈیو میں لے بنانے کے لئے اس کا استعمال ہو گا۔ کیا سٹوڈیو میں موسیقی حلال ہے؟ کیا سلیم ناز کے لئے موسیقی حرام نہیں ہے؟ اور صرف سننے والوں کے لئے حرام ہے؟ ۱۰'۱۵ بچوں کو موسیقی کے جدید آلات کے ساتھ ترانے تیار کروا کے گویا ہم نے ان بچوں کو اس موسیقی سے مزاج آشنا کر دیا ہے اور انہیں سمجھا دیا ہے کہ یہ کوئی بری چیز نہیں۔ دونوں مواقع پر جب کچھ اعتراض کیا گیا تو صرف خرم مراد صاحب سے رائے لے کر حتمی فیصلے کر دیئے گئے! موسیقی تو سراسر غلط ہے جبکہ تصویر کے معاملے میں کافی علماء کی رائے درکار ہے کہ یہ مسئلہ اس بار الیکشن کے دوران بھی پیدا ہوا ہے اور ایک کمیٹی علماء اور دانشوروں سے مشورے کے بعد رائے دے گی۔ اسی طرح آئندہ بھی کم علمی کی بنیاد پر اجتہادی فیصلے ہوتے رہیں گے تو ہم کس جانب جا نکلیں گے؟ اس ضمن میں ہوم ورک کیا جائے اور تحریکی دانشوروں سے مشورے کرنے کے بعد ہی ایک حتمی خاکہ بنایا جائے اور مشاورتی کونسل اسی کے مطابق چلنے کی پابند ہو۔ مزید برآں مرکزی شوریٰ یا صوبائی شوریٰ کے نمائندے مشاورتی کونسل کے اجلاس میں لازماً شرکت کریں تاکہ کونسل کی صحیح خطوط پر رہنمائی ہو سکے۔

یہ وہ خرابیاں ہیں جو ہماری تحریک میں شدت سے پیدا ہو چکی ہیں اور کچھ اہمیت کے حامل فیصلے ہیں جو درست ثابت نہیں ہو سکے۔ مگر ان فیصلوں کے نتیجے میں آج ہماری جو کیفیت ہے اور جس انحطاط کا ہم شکار ہیں اس کو دیکھ کر اس بھول میں نہ رہنا چاہئے کہ ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بس انقلاب آیا ہی چاہتا ہے اور ہمارے ہی ہاتھوں برپا ہو گا۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ سے لے کر آج تک بیسیوں احیائی تحریکیں اٹھیں، ہر صدی میں مجدد آئے، مگر کہیں نہ کہیں اجتہادی غلطی کرنے کے نتیجے میں وہ اسلامی حکومت یا خلافت قائم نہ کر سکے جس کی بشارت حضورؐ دے چکے ہیں۔ یقیناً یہ سفر جاری رہے گا اور کوئی نہ کوئی امام وقت کامیاب ہو جائے گا۔ ہمارا کام تو کوشش کرنا ہے اور سابقہ غلطیوں کو سامنے رکھ کر درست لائحہ عمل اپنانا ہے اور اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ بڑھتے رہنا ہے۔ باقی دنیا میں کامیابی ہونا نہ ہونا خدا کے ذمہ ہے۔ رضائے الٰہی مقصد ہے نہ کہ حصول اقتدار۔

اس معاملے میں شخصیت پرستی اور جماعتی تعصب سے بچنا انتہائی ضروری ہے یہی وہ دو خرابیاں ہیں جو خالص اسلامی تحریکوں کے کارکنان میں بھی سرایت کر جاتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ غلطیاں کر کے اور ان کا نقصان دیکھ کر بھی اپنی شخصیت پرستی اور جماعتی تعصب میں مبتلا رہتے ہوئے اپنے غلط فیصلوں کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنے آپ کو درست اور مقصد کی طرف گامزن سمجھتے ہیں۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کی مثال سامنے ہے جو ۱۸۳۱ء میں آپؒ کی شہادت کے بعد بھی چلتی رہی اور ۱۹۵۱ء تک تو اس کو بہترین رہنما بھی میسر آتے رہے حالانکہ اس وقت خالص احیائی کام سید مودودیؒ نے شروع کر دیا تھا، ان بقیہ لوگوں کو جماعت میں آ جانا چاہئے تھا مگر اپنے جماعتی تعصب اور شخصیت پرستی کے باعث ان لوگوں نے ایسا نہ کیا اور آج بھی جماعت مجاہدین سکڑی سمٹی شکل میں سرحد میں موجود ہے۔ گویا عظیم اسلامی تحریکوں کو مکمل زوال آتے بھی بیسیوں سال لگ جاتے ہیں اور وہ اپنے انحطاط کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ عالم اسلام کی عظیم الشان اسلامی اجتماعیت جس نے رواں صدی میں بے پناہ اسلامی خدمات انجام دیں، جسے ہم جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کہتے

ہیں، روبہ زوال ہے، انحطاط کا شکار ہے۔ اس کا انتہائی مضبوط نظام ہے جس کے باعث ابھی اوپری سطح پر خرابی پیدا نہیں ہو سکی وگرنہ نچلی سطح پر انقلابی سوچ اور جذبوں کا خاتمہ ہو چکا ہے اور یہ منظم اور باصلاحیت اجتماعیت جس تیزی سے اپنا تشخص کھو رہی ہے، خطرہ ہے کہ آئندہ ۳، ۴ سالوں میں خالصتاً سیاسی مزاج جس کا مذہب سے بھی Touch موجود ہو گا اس کی قیادت سنبھال لے گا اور پھر وہ اس قدر مضبوط تنظیم کو بالکل ہی دوسرے رخ پر ڈال دے گا۔ پھر یہ تحریک انقلاب کا باعث تو نہ بن سکے گی بلکہ انقلاب کی زبردست مزاحم ہو گی۔ یقیناً پہلے مجددین سے بھی غلطیاں ہوئیں۔ صحابہؓ کے بعد روئے زمین پر سب سے متقی مجدد اور متقی جماعت یعنی تحریک مجاہدین اور سید احمد شہیدؒ بھی غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے اور دنیاوی پیمانے پر ناکام ہوئے مگر ان کا اجر خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ اسی طرح اگر سید مودودیؒ سے بھی کہیں نہ کہیں کوئی اہم غلطی یا اجتہادی غلطی ہو گئی ہو تو اس میں ان کی ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ ان کا اجر خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ ان کا تجدیدی اور احیائی کام میرے نزدیک یہی ہے کہ انہوں نے پورے عالم اسلام میں اسلام کو بحیثیت نظام حیات منوایا اور غلبہ دین کا فکر بہت بڑے پیمانے پر زندہ کر دیا مگر خلافت وہ بھی قائم نہ کر سکے۔ ہم مورخ کا قلم نہیں روک سکتے ہیں، اس کو کسی سے جذباتی لگاؤ نہیں ہوتا، وہ بے لاگ تجزیہ کرتا ہے۔ وہ رواں صدی کی اسلامی تحریک یعنی جماعت اسلامی کا بھی بے لاگ تجزیہ کرے گا، اخوان کا بھی کرے گا مگر مثبت طور پر تنقید کرے گا تاکہ یہ قافلہ آگے بڑھتا رہے اور آنے والے لوگ سابقہ لوگوں سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اسی مقصد کے تحت مولانا مودودیؒ نے "تجدید و احیائے دین" تحریر کی تھی اور اس میں مجدد الف ثانیؒ اور سید احمد شہیدؒ پر تعمیری تنقید کی تھی تاکہ ہم وہاں سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ یقیناً اب بھی ایسا ہی ہو گا۔

بہرحال اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ یہ تحریک اب ختم ہو گئی ہے اور درست نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ اسی تحریک میں کوئی نیا داعی پیدا کر کے اس کے تن مردہ میں پھر سے جان ڈال سکتا ہے۔ اگر اس کے اہل حل و عقد خوب غور و فکر کے بعد اس کی تنظیم نو کریں تو ہو سکتا ہے کہ اگلا سید مودودیؒ یا سید احمد شہیدؒ یا اقبالؒ اسی تحریک کے پلیٹ فارم سے پیدا ہو

جائے' وگرنہ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ سید مودودیؒ کا فکر جس بڑے پیمانے پر پھیلا ہے اس کے اثرات آئندہ احیائے دین کے لئے اٹھنے والی ہر تحریک اور ہر جماعت میں موجود ہوں گے۔ آج جس قدر اس عظیم فکر کو لے کر ہم چل رہے ہیں اتنا تو اہل حدیث بھی اسے اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کی لائبریریاں بھی تفہیم القرآن اور دیگر تحریکی کتب سے مزین نظر آتی ہیں۔ اسی فکر پر دعوت ارشاد' تنظیم الاخوان اور تنظیم اسلامی آگے بڑھ رہی ہیں' منہاج القرآن میں بھی اس احیائی فکر کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ آج اگر صرف "ذکر" تک محدود رہنے والے نقشبندیہ سلسلے کے لوگ "جہاد" کا نعرہ تنظیم الاخوان کے پلیٹ فارم سے بلند کر رہے ہیں تو یقیناً اس کا کریڈٹ اسی احیائی فکر کو جاتا ہے جسے لے کر جماعت آج سے پچاس سال قبل آگے بڑھی تھی۔ گویا یہ فکر اب سرد خانے میں جانے کا نہیں اور تجدید و احیائے دین کا قافلہ اب بیسیوں سال تک کسی نئے داعی کا انتظار نہیں کرے گا بلکہ تسلسل سے آگے بڑھتا رہے گا اور جلد ہی ان جماعتوں میں سے کوئی جماعت یا شخصیت اس قافلے کی قیادت سنبھال لے گی۔ اب اسلامی تحریک' پاکستان میں صرف جماعت اسلامی کی میراث نہیں' اور لوگ بھی جاگ اٹھے ہیں اور اگر ہم نے اپنا نصب العین چھوڑا تو یہی لوگ آگے بڑھ کر قیادت سنبھال لیں گے۔ بلکہ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ اگلا امام وقت تبلیغی جماعت میں ہی پیدا ہو جائے جو تبلیغیوں میں جہاد کی روح پھونک دے تو اب تک کا کیا ہوا ان کا اصلاحی کام ضائع نہیں جائے گا کیونکہ دین کی خاطر وقت اور مال لگانے کی سوچ تو ان کے ہاں موجود ہی ہے اور پھر اطاعت امیر' باہم اخوت اور پوری دنیا میں تبلیغی سرگرمیاں احیائی کام کے لئے بہترین اثاثہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہم تو تجدید و احیائے دین کے قافلے کے ساتھی ہیں' ہمیں جو قافلہ اس منزل کی طرف جاتا نظر آیا' ان شاء اللہ بلا جھجک اس میں شامل ہوں گے۔ اگر آج بھی ہم اپنی غلطیوں کا جائزہ لے کر بہت بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں تسلیم کر لیں اور خدا سے استغفار کر کے نئی بنیادیں رکھ دیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو یقیناً ہم پھر سے جانب منزل رواں دواں ہو سکتے ہیں مگر اس کے لئے بہت بڑی جرأت' ہمت' استقامت اور عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔

میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ اللہ کے بھروسے پر کمر ہمت کس لیجئے اور تنظیم نو کا

باقی صفحہ ۸۰ پر

گوشۂ خواتین

اچھّے دن کون سے؟

طیبہ یاسمین، لاہور

انسان کو پیدا ہوتے ہی اچھے دنوں اور اچھے حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی کے آغاز ہی سے جب وہ بظاہر ایک بے بس لوتھڑا ہوتا ہے اسے پیار، محبت، آرام اور اچھے سلوک کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ منہ سے خواہ کچھ بھی نہ کہہ سکے مگر بھوک، سردی، گرمی، درد اور گیلے سوکھے ہونے کا احساس اسے پوری طرح ہوتا ہے۔ وہ محبت، روکھے پن اور شفقت بھرے رویے کو پوری طرح محسوس کر سکتا ہے۔ اسے صحت مند شخصیت بنانا اور زمانہ کے سرد و گرم سے بچانا ماں باپ کا فرضِ اولین ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنی معاشرتی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اسے زندگی کی معصوم سی خوشیوں اور تلخیوں سے واسطہ پڑتا ہے، مگر اتنا ہی کہ کبھی ہجولیوں سے کھیلنا، لڑنا، روٹھنا، منانا، کبھی بڑوں سے ضد، کبھی فرمانبرداری اور کبھی محبت، کبھی مار کٹائی۔ یونہی زندگی کے ابتدائی چند سال گزر جاتے ہیں تو تعلیمی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ گویا اب بالکل بے فکری کا زمانہ گزر گیا۔ کچھ ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں، مگر پھر بھی بڑی محدود سی۔

انسان اپنی ذمہ دار زندگی کا آغاز بڑے ہلکے طریقے سے کرتا ہے اور آخر میں سر سے پاؤں تک ذمہ داریوں کے بوجھ میں جکڑا جاتا ہے۔ ہر پچھلا دور موجودہ دور سے بہتر لگتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں بچپن کے ابتدائی دن بہت سہانے اور خوشگوار لگتے ہیں۔

زندگی مختلف ادوار سے گزرتی رہتی ہے۔ ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا رہتا ہے۔ زندگی کے مختلف معاملات، تعلقات اور تجربات ہوتے رہتے ہیں، کبھی ہنسنا، کبھی رونا، کبھی غم، کبھی خوشی، ناکامی، کامیابی --- زندگی مختلف ادوار میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اور یوں بچپن، لڑکپن، عالم شباب، ادھیڑ عمر اور بڑھاپا آن لیتا ہے۔ ان سارے عرصوں میں انسان اپنے حالات، قسمت اور دور کے حساب سے اپنی ذمہ داریوں کو رنج و غم، محنت اور مشقت کے

ساتھ گزارتا رہتا ہے۔ کبھی ناکامیوں کی تلخی کا گھونٹ پینا پڑتا ہے تو کبھی کامرانیوں کی شادمانی سے سرشار ہوتا ہے۔ عزیزوں کی رفاقت' جدائی کے تجربات' مالی و ذہنی خوشیوں اور اداسیوں کے احساسات' انسان ہر دم مختلف جذبات و احساسات سے گزرتا رہتا ہے۔ جو کچھ اس کے ساتھ پیش آئے' خواہ وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہو یا تقدیر کا لکھا' مجبوری یا خوشی دونوں طرح برداشت کرنا پڑتا ہے۔

الفاظِ قرآنی "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی کَبَدٍ" کی رو سے انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ ہر جانے والا دَور آنے والے دَور سے آسان لگتا ہے۔ تعلیم مکمل ہو اور دنیا کے کھکھیڑوں میں قدم رکھیں تو تعلیمی دور بڑا خوشگوار ہو کر یاد آتا ہے' جیسے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ تلخیاں اور پریشانیاں بھی معصوم اور بے ضرر سی لگتی ہیں۔ پھر بچوں کی پیدائش کے مرحلے' ان کی تربیت' سماجی زندگی کے رشتوں اور ہر قسم کے انسانوں سے نبھاہ کرنے کی مشقت' سب دور گزرتے ہوئے بڑے کٹھن لگتے ہیں مگر گزر کر آسان اور اگلا مرحلہ مشکل لگتا ہے۔ پھر انسان بچوں کی شادیوں اور ان کو زندگی میں set کرنے کے معاملات میں الجھ جاتا ہے تو پھر پچھلا دور آسان لگتا ہے' دلچسپ اور خوشگوار یادوں والا۔ بچوں کا ساتھ' ان سے چہلیں' ڈانٹ ڈپٹ' پیار محبت' ان کے کام کر کے تھکنا' ان کے انتظار میں بے چین رہنا' ان کی رفاقت سے لطف اندوز ہونا' ہر دم ان کی صحت' سلامتی اور خیر خواہی میں لگے رہنا' ان کی ہر قسم کی جسمانی' ذہنی' مالی' تعلیمی اور دینی ضروریات پورا کرنا' اف یہ اس وقت سب کچھ کتنا مشکل لگتا ہے مگر جب وہ جوان ہو جاتے ہیں تو وہی دور کتنا خوشگوار لگتا ہے۔ اب انسان کی اپنی ذہنی و جسمانی توانائیاں زوال پذیر ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو انسان سوچتا ہے کہ یہ کتنا مشکل دور ہے' پچھلا دور کتنا آسان تھا۔ پھر جب بچے بفضل اللہ تعالیٰ اپنی ذمہ دار زندگیوں کا آغاز کرتے ہیں تو اندیشے' فکر اور وسوسے گھیر لیتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے' کہیں ویسا نہ ہو جائے!

جب اپنی توانائیاں گھٹنی شروع ہوتی ہیں تو پھر پچھلا دور کتنا اچھا لگتا ہے جب جسم میں جان اور طاقت تھی' بچے اپنے پاس تھے' ان کی رفاقت اور صحبت ہوتی تھی' والدین اور بچے ایک دوسرے کی ذات کا مرکز تھے' وہ دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک

اور اپنی خوشیوں غموں میں ہم راز تھے۔ پھر یہ دور بھی گزر جاتا ہے۔ بچوں کے بچوں کی ننھی ننھی خوشیاں ملتی ہیں۔ کبھی انسان ان سے خوش ہوتا ہے' کبھی ان کی پریشانی سے پریشان۔ ان پر اپنی جان اور محبت نچھاور کرتا ہے۔ مگر اب بوڑھی جان میں رہ ہی کیا جاتا ہے۔ جذباتی' جسمانی' ذہنی ہر لحاظ سے وہ نحیف و نزار ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ پچھلا دور ہی اچھا تھا جب جسم میں طاقت تھی' شخصیت میں کشش تھی' اس کی ضرورت سب کو تھی۔ اب اسے یہ اندیشے لاحق ہوتے ہیں کہ نہ جانے زندگی کے بقایا برس کیسے گزریں گے --- کہیں وہ محتاج ہو کر اپنے بچوں کے لئے وبال جان نہ بن جائے' جسمانی طور پر کمزور ہو کر اپنے ذاتی کام بھی نہ کر سکے --- نہ جانے آخری برسوں میں صحت کیسی رہے اور کیا کچھ برداشت کرنا پڑے --- وہ محبت جو کبھی اس کا بِن مانگا حق تھا اب مانگنے پر بھی ملے نہ ملے --- اس کے وجود سے نہ جانے کون کون گھبرانے لگے۔ اور کیا خبر زندگی کے یہ آخری برس کتنے خوشگوار ہوں -- احترام' محبت' صحت اور اطمینان کے برس بھی ہوں۔ مگر یہ تو اسی وقت پتہ چلے گا جب وہ دَور بیت رہا ہو گا۔

ہر دور پچھلے دور سے بہتر لگتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ آنے والا دور' جو ابدی ہونا ہے' وہ ہر دور سے بہتر ہو۔ وہ آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہونے والا ہے۔ وہ بہترین بھی ہو سکتا ہے۔ اندیشوں' وسوسوں' تلخیوں' محرومیوں اور پریشانیوں سے پاک۔ وہاں جو چاہیں گے ملے گا' نہ کوئی بری بات سننے کو ملے گی نہ دیکھنے کو۔ نہ جذبات کو ٹھیس پہنچے گی نہ مشقت ہو گی اور نہ ہی محبت میں کمی کے اندیشے ہوں گے۔ اور پھر انسان یہی کہے گا کہ یہی دور سب سے اچھا ہے' ہمیشہ رہنے والا' پرسکون' خوشیوں سے بھرپور اور کبھی نہ ختم ہونے والا --- مگر اس کے لئے تیاری دنیا میں آنکھ کھلنے کے ساتھ بند ہونے تک مسلسل کرنی پڑتی ہے۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے :

> (ترجمہ) "زمانے کی قسم' تمام انسان خسارے میں ہیں' سوائے ان کے جو ایمان لائے' جنہوں نے اچھے عمل کئے' باہم ایک دوسرے کو حق کی تاکید کی اور صبر کی تلقین کی۔"

ایک سالہ

رجوع الی القرآن

کورس

بمقام

قرآن کالج لاہور

۱۹۱-اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، فون : 5833638

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

پس منظر اور مقاصد

موجودہ دور میں ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ جو لوگ دنیوی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے قیمتی چودہ یا سولہ سال سکولوں اور کالجوں کی نذر کر دیتے ہیں، وہ بالعموم دینی تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے وہ افراد جو دینی تعلیم کے حصول کے لئے ابتدا ہی سے دینی مدارس کا رخ کرتے ہیں وہ اکثر و بیشتر دنیوی تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے کا اصل بہاؤ دنیوی تعلیم ہی کی جانب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ پڑھے لکھے لوگوں کی ایک عظیم اکثریت بی اے اور ایم اے کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے کے باوجود دینی تعلیمات سے قطعی ناواقف ہوتی ہے بلکہ ان میں اکثر قرآن حکیم کو سمجھنا تو درکنار، اسے ناظرہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں ہوتے۔ گویا دینی لحاظ سے ایسے لوگوں کو اگر پڑھے لکھے ان پڑھ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حالانکہ بحیثیت مسلمان ہماری ایک نہایت اہم ذمہ داری یہ ہے کہ دین کا بنیادی علم حاصل کریں اور بالخصوص قرآن حکیم کو، جو سرچشمہ ہدایت ہی نہیں منبع ایمان و یقین بھی ہے، سمجھ کر پڑھیں اور اس سے وہ ہدایت و نصیحت اخذ کریں جس کا خزانہ اس کتاب عظیم کی ایک ایک آیت اور ایک ایک سطر میں موجود ہے، تاکہ عملی زندگی کو اس کے مطابق استوار کیا جا سکے۔ یہ چیز اگرچہ ہر مسلمان کے لئے لازم و واجب ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جنہوں نے دنیوی تعلیم کے حصول میں برسہا برس صرف کئے ہوں، گویا فرض عین کا درجہ رکھتی ہے---- ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے عربی زبان کو اس

حد تک سیکھنا کہ پھر قرآن حکیم کو پڑھتے ہوئے کسی مطبوعہ ترجمے کی مدد کے بغیر براہ راست قرآن حکیم کا مفہوم سمجھ میں آتا چلا جائے' ناگزیر ہے۔ اسی طرح حدیث نبویؐ کے مطالعے کے لئے بھی' جو درحقیقت قرآن حکیم ہی کی شرح اور حکمت و احکام دین کا ایک عظیم خزانہ ہے' عربی زبان کا سیکھنا از حد ضروری ہے!

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کا اصل مقصد یہی ہے کہ ایسے حضرات کو جو بی اے اور ایم اے تک دنیوی تعلیم حاصل کر چکے ہوں' ان بنیادی علوم سے مسلح کر دیا جائے جو قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنے اور فہم دین کے حصول کے لئے ضروری ہوں۔ گویا ایک سال کے عرصے میں طلبہ کو (i) اتنی عربی پڑھا دی جائے کہ عربی زبان کے بنیادی قواعد پر انہیں عبور حاصل ہو جائے تاکہ پھر کچھ مزید اضافی محنت اور وقت لگا کر وہ یہ استعداد حاصل کر لیں کہ قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے اس کا مفہوم بھی انہیں ساتھ ساتھ سمجھ میں آتا چلا جائے اور قرآن حکیم سے ہدایت و نصیحت اخذ کرنے کے لئے انہیں کسی ترجمے کا مرہون منت نہ ہونا پڑے۔ (ii) تجوید کے بنیادی قواعد سکھا کر اتنی مشق کرا دی جائے کہ وہ قرآن کو صحیح طور پر پڑھ سکیں' (iii) قرآن حکیم کے منتخب مقامات کے مطالعے اور تدریس کے ذریعے دین کا صحیح اور جامع تصور واضح انداز میں پیش کیا جائے تاکہ طلبہ پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ہمارا دین کیا ہے؟ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور یہ کہ دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی عملی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ (iv) علم حدیث کے بنیادی اصولوں سے اور علم فقہ کی مبادیات سے طلبہ کو روشناس کرا دیا جائے تاکہ پھر وہ اپنی آئندہ زندگی میں اپنی اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق ان اہم دینی علوم میں پیش رفت کر سکیں اور اپنے دینی علم کے دائرے کو مزید وسعت دے سکیں! (v) طلبہ میں اس بات کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ قرآن حکیم کے پیغام کو اور رجوع الی القرآن کی دعوت کو دوسروں تک پہنچا سکیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق کہ "خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ" وہ تعلیم و تعلم قرآن کے کام کو آگے بڑھانے کا فریضہ سرانجام دے سکیں!

نصاب

۱ - تجوید و حفظ
۲ - عربی زبان :
i) قواعد عربی (گرامر)
ii) درسی کتاب (عربیک ریڈر)
۳ - مطالعہ قرآن حکیم---ایک منتخب نصاب
۴ - دینی تحریکی لٹریچر (بذریعہ کتب، لیکچرز اور کیسٹس)
۵ - حدیث :
i) اصول حدیث
ii) مطالعہ حدیث---انتخاب از کتب احادیث
۶ - فقہ / اصول فقہ

تدریسی نظام

اس کورس میں داخلے ستمبر کے اواخر تک مکمل کر لئے جاتے ہیں اور تدریس کا آغاز اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ہوتا ہے۔ نصاب تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے کورس کی تدریس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا دورانیہ قدرے طویل ہے، یعنی اکتوبر تا فروری (۵ ماہ)، جبکہ دوسرے اور تیسرے حصے کا دورانیہ تین تین ماہ پر مشتمل ہے۔ یعنی مارچ تا مئی اور پھر جولائی تا ستمبر۔ درمیان میں جون کے مہینے میں موسم گرما کی تعطیلات کے باعث تدریسی نظام معطل رہتا ہے۔ تدریسی نظام کی تفصیلات حسب ذیل ہیں :

اکتوبر تا فروری

۱ - تجوید و حفظ (صحیح طریقے پر قرآن مجید پڑھنے کی استعداد پیدا کرنے کے لئے اس مضمون کو شامل نصاب کیا گیا ہے۔ مخارج کی پہچان اور تلفظ کی درستی کی خاطر تجوید کے اصول و قواعد پڑھائے جاتے ہیں اور مناسب حد تک مشق کرادی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی آخری دس

سورتوں اور منتخب نصاب میں شامل آیات کا حفظ بھی نصاب میں شامل ہے۔)

۲ ۔ عربی قواعد (آسان عربی گرامر حصہ اول، دوم مکمل، اور حصہ سوم کے اسباق تعلیلات تک)

۳ ۔ عربی کی درسی کتاب (قصص النبیین ۔ ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ اور عربی عبارت کے فہم کے لئے)

۴ ۔ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (فکری و عملی رہنمائی کے لئے قرآن حکیم کے منتخب مقامات کی تدریس بذریعہ آڈیو کیسٹ، درس دینے کی مشق کے ساتھ)

۵ ۔ دینی تحریکی لٹریچر کا مطالعہ (بذریعہ کتب، لیکچرز، اور کیسٹس)

مارچ تا مئی

۱ ۔ عربی قواعد (آسان عربی گرامر حصہ سوم کے بقیہ اسباق)

۲ ۔ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (جاری)

۳ ۔ ترجمہ قرآن (منتخب نصاب میں شامل قرآن حکیم کی سورتوں اور آیات کا گرامر کے لحاظ سے تجزیہ و ترجمہ)

۴ ۔ دینی تحریکی لٹریچر کا مطالعہ

جولائی تا ستمبر

۱ ۔ تجوید (حفظ کردہ سورتوں اور آیات کی مشق، قواعد تجوید کو ملحوظ رکھتے ہوئے)

۲ ۔ ترجمہ قرآن (گرامر کے لحاظ سے تجزیہ و ترجمہ سورہ بقرہ کے آغاز سے)

۳ ۔ اصول حدیث اور مطالعہ حدیث (اربعین نووی اور مشکوۃ شریف کے منتخب ابواب)

۴ ۔ تعارف فقہ و اصول فقہ

۵ ۔ دینی تحریکی لٹریچر کا مطالعہ

کورس کی سند

اس کورس کی سند صرف ایسے طلبہ کو جاری کی جائے گی جن کی مجموعی حاضری ۷۵ فیصد اور ہر مضمون کے ماہانہ ٹیسٹوں میں حاصل کردہ نمبروں کا اوسط ۵۰ فیصد سے کم نہ ہو

قواعد و ضوابط

۱۔ کلاس میں تاخیر سے آنے، اسباق اور ماہانہ ٹیسٹ سے غیر حاضری یا کالج کے نظم و ضبط کی پابندی نہ کرنے والے طلبہ کے خلاف کالج کے مروجہ قواعد و ضوابط کے مطابق تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

۲۔ اگر انتظامیہ نے محسوس کیا کہ کوئی طالب علم

(ا) کلاس کے ساتھ نہیں چل پا رہا، یا

(ب) اس میں مناسب استعداد موجود نہیں ہے، یا

(ج) وہ محض وقت گزاری کے لئے کلاس میں شامل ہوا ہے، یا

(د) اس کا کردار اور چال چلن غیر مناسب اور ادارے کے حق میں نقصان دہ ہے

تو کالج کے مروجہ قواعد و ضوابط کے مطابق ایسے طالب علم کا کالج (اور اقامت گزیں ہونے کی صورت میں دار الاقامہ سے) اخراج عمل میں لایا جائے گا۔

۳۔ جو طلبہ کالج کے دار الاقامہ (ہوسٹل) میں اقامت گزیں ہونا اور اس کے دار الطعام سے مستفید ہونا چاہیں گے، انہیں ہر دو کے قواعد و ضوابط کی پوری پابندی کرنا ہوگی۔

فیس

۱۔ فیس داخلہ	۱۰۰ روپے (بوقت داخلہ)
۲۔ میگزین فنڈ سالانہ	۲۵ روپے
۳۔ فیس امتحانات سالانہ	۵۰ روپے
۴۔ لائبریری سیکورٹی	۱۰۰ روپے، قابل واپسی
۵۔ ٹیوشن فیس (سہ ماہی)	۷۵۰ روپے (بحساب ۲۵۰ روپے ماہانہ)

فیس میں رعایت

محدود تعداد میں طلبہ کے لئے فیس میں نصف رعایت یا کلیۃً معافی کی گنجائش موجود ہے۔ تاہم فیس میں کسی قسم کی رعایت کا فیصلہ طلبہ کی گزشتہ تعلیمی کارکردگی اور اس کے

والد / سرپرست کی معاشی حالت کی مشترکہ بنیاد پر ہو گا۔

رعایت دینے یا نہ دینے کا فیصلہ کرنے کے مجاز انجمن کے صدر موسس / ناظم اعلیٰ ہوں گے۔

دارالمقامہ (ہاسٹل)

- انجمن کے دارالمقامہ (ہاسٹل) میں محدود تعداد میں طلبہ کی رہائش اور خوراک کا انتظام ممکن ہو گا۔
- اگر دارالمقامہ میں رہائش کے خواہش مند طلبہ کی تعداد گنجائش سے زیادہ ہو گی تو ان کے درمیان ترجیحی فیصلہ ان کی گزشتہ تعلیمی کارگردگی یا داخلہ ٹیسٹ / انٹرویو کی بنیاد پر ہو گا۔

دارالمقامہ میں رہائش اور خوراک کے اخراجات حسب ذیل ہوں گے :

ہاسٹل اخراجات

i) سیکورٹی فیس (بوقت داخلہ)	۱۰۰ روپے قابل واپسی
ii) ڈارمیٹری (ایک کمرے میں چار تا چھ طلبہ کی رہائش)	۱۵۰ روپے ماہانہ فی طالبعلم
iii) بائی سیٹر (ایک کمرے میں دو طلبہ کی رہائش)	۲۵۰ روپے " " "
iv) میس کے یوٹیلٹی چارجز (رعایتی)	۵۰ روپے " " "
v) طعام کے اخراجات	۴۵۰ روپے " " "

واضح رہے کہ فیس / ہاسٹل کے اخراجات میں رعایت حاصل کرنے والے طالب علم کو بائی سیٹر میں رہائش نہیں دی جائے گی۔

نوٹ : قرآن کالج، دارالمقامہ اور دارالطعام کے قواعد و ضوابط اور فیس و اخراجات میں پیشگی اطلاع کے بغیر ترمیم اور تبدیلی کا پورا حق انتظامیہ کو حاصل ہو گا۔

رجوع الی القرآن کورس ــ ایک تعارف

ــــ لطف الرحمٰن خان، ناظم قرآن کالج ــــ

(۱۲/ ربیع الاول ۱۴۱۶ھ کو قرآن کالج کی تعارفی تقریب سے خطاب)

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کے تعارف کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے۔ کورس کے متعلق بات کرنے سے پہلے چند تمہیدی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اولاً اپنا مختصر سا تعارف کرانا مقصود ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں اسٹیٹ لائف میں انشورنس ایجنٹ تھا، پھر اللہ نے توفیق دی تو یہاں پہنچا۔ اس وقت اس کورس کا دورانیہ دو سال تھا، میں نے اس میں داخلہ لیا، صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک قرآن اکیڈمی میں تعلیم حاصل کرتا اور دو بجے کے بعد اپنا کاروبار سنبھالتا تھا۔ کورس سے فارغ ہونے کے بعد صبح کا وقت قرآن اکیڈمی کے لئے وقف کر دیا اور ظہر کے بعد بدستور کاروبار سنبھالتا رہا۔ ۱۹۹۰ء میں جب کالج قرآن اکیڈمی سے قرآن آڈیٹوریم کی عمارت میں منتقل ہوا تو کام کی زیادتی کی وجہ سے بیمہ کے کاروبار سے کلیتاً فراغت حاصل کر لی۔

یہ تعارف میں نے اس غرض سے کروایا ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ رجوع الی القرآن کورس کے متعلق میں جو کچھ بھی عرض کروں گا وہ ذاتی تجربے اور طلباء کے مشاہدے کی بنیاد پر ہو گا۔ اور اس میں نظریاتی بحث (تھیوری) کا عنصر شامل نہیں ہو گا۔

رجوع الی القرآن کورس کے متعلق میرا جو بھی تجربہ اور مشاہدہ ہے اس کا تعلق اس دنیا کی زندگی سے ہے، اس لئے کہ آخرت کی دائمی زندگی میں اس کا جو بھی تجربہ اور مشاہدہ ہونا ہے وہ ابھی تک نہیں ہوا ہے گو کہ اس کا وقت بہت قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تعارف میں اس کورس کی اخروی اور دائمی نعمتوں کا آپ کو کوئی ذکر نہیں ملے گا۔ البتہ اس مادی اور عارضی زندگی کے فوائد سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کورس کی اخروی اور دائمی نعمتیں کیا ہوں گی۔

رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لیتے وقت میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ جب میں قرآن پڑھوں یا سنوں تو ترجمہ کے بغیر اسے سمجھ سکوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں تلاوت کرتا تھا' نماز میں قرآن پڑھتا تھا' یا جہری رکعتوں بالخصوص تراویح میں قرآن سنتا تھا تو یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا اور یہ سارے کام مجھے غیر منطقی اور بامشقت محسوس ہوتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ ہمارے دانشور اگر روزہ نماز کو Ritual کہتے ہیں تو یقیناً ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ ان کاموں سے فراغت حاصل کر کے یہ احساس تو ہوتا تھا کہ ایک رسم تھی جو ادا کر دی گئی یا قرض کا ایک بوجھ تھا جو ہلکا ہو گیا' لیکن اس کے ساتھ ہی عبودیت اور بندگی کے احساس سے محرومی کا ایک کانٹا چبھ جاتا تھا۔

دو سال کی کوشش کے بعد Ritual کے اندھیرے چھٹنا شروع ہوئے اور قرآن فہمی کا نور آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ تب صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ Ritual میں اور عبادت میں کیا فرق ہے' Ritual کیوں ایک بوجھ اور مشقت محسوس ہوتی ہے اور عبادت کس طرح انسانی روح کی غذا بن کر ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کا باعث بنتی ہے۔

قرآن فہمی کے نور میں یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن اپنے سمجھنے والوں کی کس طرح پذیرائی کرتا ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کو تو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کو اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہو۔ البتہ قرآن کی پذیرائی کے تجربے کے حوالے سے دو باتیں مجھے سمجھ میں آئی ہیں جو میں آپ کے ساتھ Share کرنا چاہتا ہوں۔

وعظوں اور خطبات میں سنتے آئے تھے اور بعد میں پڑھا بھی تھا کہ جنت کی کچھ نعمتیں ایسی ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کسی کان نے سنیں اور نہ ہی قلب پر ان کا احساس وارد ہوا۔ اس بات پر یقین تو پہلے بھی تھا لیکن قرآن کی پذیرائی کے تجربے نے اسے حق الیقین کے درجے تک پہنچا دیا ہے کہ واقعی ایسی نعمتوں کا وجود ہے' اس لئے کہ اس کورس میں شمولیت تو یقیناً قرآن سمجھنے کی نیت سے کی تھی' لیکن قرآن سمجھنے کے نتیجے میں جو کیفیت نصیب ہوئی ہے اس کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

اسی طرح سنتے آئے تھے اور پڑھا بھی تھا کہ جنت میں جنتی لوگوں کو جو شراب پلائی

جائے گی وہ ان کی عقل کو متاثر نہیں کرے گی۔ اس کا بھی عملی تجربہ اس دنیا میں کس حد تک مجھے حاصل ہو گیا۔ قرآن فہمی کا جو نشہ ہے وہ کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے گزشتہ چھ سات سال سے میری قرآن فہمی کی صلاحیت بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی ہے اور اسی طرح قرآن فہمی کے نشے میں دن بدن اک تازگی کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اس نشہ کی حلاوت اور شیرینی میں نہ تو کوئی کمی واقع ہوئی ہے اور نہ ہی سیری کا احساس ہوا ہے۔

قرآن فہمی کے حوالے سے جو تیسری نعمت مجھے نصیب ہوئی ہے اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ رجوع الی القرآن کورس میں شمولیت سے پہلے دنیاوی اعتبار سے میرے پاس بہت کچھ تھا۔ مختصراً یہ بتا دینا کافی ہو گا کہ کورس میں شمولیت سے قبل میں نے ایک سال چودہ ہزار روپے انکم ٹیکس ادا کیا' لیکن اس کے باوجود میں اپنے اندر روح میں مسلسل ایک بے کلی اور بے کیفی کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا' جو برس ہا برس سے چلی آ رہی تھی۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے مختلف جتن کئے' بہت سے مشغلے اپنائے' مختلف کلبوں کا ممبر بنا اور آخر میں روٹری کلب اور اسلامک فلاسفیکل سوسائٹی میں بھی شمولیت اختیار کی' لیکن وہ جو ایک کشتی سی تہہ آب تھی' وہ تہہ آب ہی رہی۔ البتہ جیسے جیسے قرآن فہمی کا نور پھیلتا گیا ویسے ویسے طبیعت کی بے چینی اور بے کیفی آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔ اگر ماسلو (MOSLOW) کی اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ بات میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ Self fulfilment اور Self actualization کو میں نے دنیا میں بہت تلاش کیا' لیکن یہ چیز اگر مجھے ملی ہے تو قرآن فہمی کی بدولت ملی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب میں اپنی زندگی جس قلبی اطمینان کے ساتھ بسر کر رہا ہوں اس کا میں پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب چند باتیں میں اس کورس کے فارغ التحصیل طلباء کے مشاہدات کی بنیاد پر آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ ایسے طلباء سے جب بھی رابطہ ہوتا ہے تو ان سے پوچھے بغیر مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد کون سکون کی نعمت سے بہرہ مند ہوا ہے اور کون ابھی تک اس سے محروم ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد جو طلباء قرآن فہمی کی مشق جاری رکھتے ہیں اور جو کچھ بھی علم حاصل کیا ہے' اسے آگے تقسیم کرنا شروع کر دیتے ہیں'

ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک کیفیت، ان کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز، ان کے بات کرنے میں ایک ٹھہراؤ اور ایک اعتماد کی کیفیت، غرض ہر چیز الگ نظر آتی ہے۔ اور وہ طلباء جنہوں نے اس کورس کے علم کو اپنے ذاتی استعمال میں تو رکھا لیکن اسے آگے پھیلانے کی کوشش نہیں کی ان کی داخلی کیفیات کا عکس بالکل مختلف ہوتا ہے۔

کورس سے فارغ ہونے کے بعد قرآن فہمی کی مشق جاری رکھنے اور علم کو آگے پھیلانے کے لئے اپنے دفتر یا کاروبار سے کلیتاً فراغت حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔ بے شمار طلباء ایسے ہیں جنہوں نے اپنے گاؤں، محلے یا دفتر میں مختلف حلقے بنا لئے ہیں اور تعلیم و تعلم کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنی معاشی ذمہ داریوں کو پورا وقت دینے کے بعد یہ کام ایسے وقت میں کر رہے ہیں جو پہلے بالعموم بے معنی تفریحات میں صرف کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے ایک سال کے لئے تو اپنے کاروبار سے فراغت حاصل کی تھی اور اب واپس جا کر وہی کاروبار کر رہے ہیں، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ انہیں اب اپنی زندگی بامقصد نظر آتی ہے اور انہیں اپنی زندگی کی افادیت کا احساس ہے۔ یہی احساس انکے داخلی امن کی بنیاد ہے۔ یہ ان کا اس دنیا کا اجر ہے اور آخرت کے اجر کا کھاتہ الگ ہے۔

اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر آخری بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس نعمت کو حاصل کرنے کی ہمت کرتے ہیں اور اس کورس میں شمولیت کا عزم کرتے ہیں انہیں اس کی تین قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اولاً یہ کہ جیسے ہی وہ اس کا ارادہ کرتے ہیں شیطانی وسوسوں کا شدید ترین حملہ ہوتا ہے اور مستقبل کے بے شمار اندیشے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ جو لوگ اس سے بچ نکلتے ہیں ان پر پھر نصیحت کرنے والوں کا حملہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ استہزاء کے انداز میں نصیحت کرتے ہیں کہ میاں اچھے بھلے تھے، اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیوں اپنا مستقبل تباہ کر رہے ہو؟ اپنا نہیں تو بچوں کا ہی خیال کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ کچھ لوگ بہت پیار اور ہمدردی سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح ارادہ تبدیل ہو جائے۔

جو ان سے بھی بچ نکلتے ہیں اور کورس میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان کی آزمائش کرتا ہے۔ اکثر و بیشتر طلباء کو کورس کے دوران مختلف مسائل، الجھنوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو کورس کا سلیبس، کسی کو استاد کے پڑھانے کا انداز،

اور کسی کو انتظامیہ کی کارکردگی پسند نہیں آتی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو خاندان میں شادی و غمی کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ غرض یہ کہ نوعیت کچھ بھی ہو' کورس کے ابتدائی مرحلہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی نہ کسی رنگ میں آزمائش ضرور آتی ہے۔ یہ آخری آزمائش ہوتی ہے اور جو طلباء اس میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں وہ الحمد للہ یہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر جاتے ہیں' خالی ہاتھ کوئی نہیں جاتا۔

میری آخری گزارش یہی ہے کہ خود بھی ہمت کریں' اپنے حلقے میں دوسروں کی ہمت افزائی کریں' یہ نعمتیں حوصلے والوں کو ہی ملتی ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ حوصلے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں۔

بقیہ : دعوت فکر

کٹھن کام کر گزریئے۔ جمعیت کو درست سمت میں ڈالنا زیادہ مشکل نہ ہو گا' شاید یہ بہت بڑا کام خدا آپ ہی سے لے لے' مگر تجدید و احیائے دین کے ایک بہت بڑے کام کو درست سمت گامزن رکھنے کے لئے کچھ مشکل اور تلخ فیصلے کر گزریں تو اس کے نتیجے میں ہمیں بعض جگہ پسپائی کا سامنا تو کرنا پڑ سکتا ہے مگر یہ نقصان اس نقصان سے کئی درجہ کم ہو گا جو اسی سمت چلتے رہنے کے نتیجے میں آئندہ چند سالوں کے بعد احیائے دین کے عظیم کام کو ہو گا۔ جماعت کے غلط رخ پر چلنے کے بعد لوگوں کا اسلام پر سے اعتبار اٹھ جائے گا۔ خدارا اس عظیم نقصان سے بچنے کی خاطر ابھی سے اپنا پورا رخ اور دھارا بدل ڈالئے تاکہ ہم پھر سے صحیح جانب سفر شروع کر سکیں۔ شاید یہ کوششیں رنگ لے آئیں۔ ہم تو یہ عہد بھی کر چکے ہیں کہ ہماری نماز' عبادت' زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔ پھر یہ تو ہمارا فرض عین ہے کہ ہم اپنی خرابیوں کا تدارک کرنے کی کوشش کریں۔ منجانب : شاہد مجید

ضرورت رشتہ

تعلیم یافتہ' معزز اردو سپیکنگ خاندان کی ۲۲ سالہ' ایف۔ اے بیٹی کے لئے دینی مزاج کا حامل رشتہ مطلوب ہے۔۔۔۔ معرفت ماہنامہ میثاق' K-36' ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلۂ اقبالیات میں "بقامتِ کہتر و لے بقیمتِ بہتر" کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علّامہ اقبال اور ہم

جو کئی سال سے آؤٹ آف پرنٹ تھی،

اب اس کتاب کا نیا نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے، جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے :

- فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں
  از قلم : ڈاکٹر اسرار احمد
- حیات و سیرتِ اقبال
- فلسفۂ اقبال
- ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام
  از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم
- اقبال اور قرآن، از قلم : سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت، دیدہ زیب طباعت، صفحات ۱۴۴

قیمت : اشاعت خاص (سفید کاغذ، پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے

اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Reg No L. 7360
Vol. 44 No. 9
Sep. 1995

پاکستان کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا

جوہر جوشاندہ

فلو، نزلہ، زکام اور گلے کی خراش کا مؤثر علاج

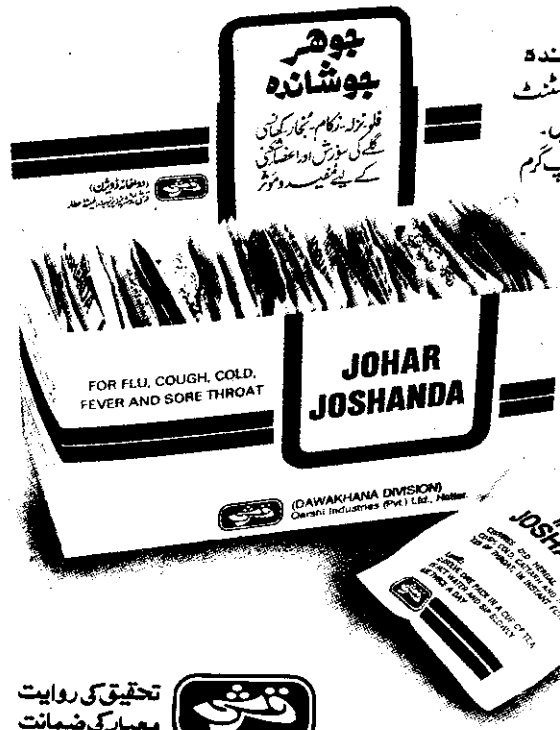

صدیوں سے آزمودہ جوشاندہ
اب فوری حل ہونے والے انسٹنٹ
جوہر جوشاندہ کی شکل میں۔
ترکیبِ استعمال: ایک کپ گرم
پانی یا چائے میں ایک پیکٹ
جوہر جوشاندہ ملائیں
اور جوشاندہ تیار۔
دن میں دو یا تین پیکٹ
جوہر جوشاندہ
استعمال کریں۔

تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت

آسان استعمال
مؤثر علاج